(1148)

جولائی ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

پاکستان کی موجودہ سیاست ــــ اور
تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کا موقف
ــــــــ ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

آپ نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرلیا!

اللہ آپ کو مبارک کرے !!

یہ دراصل علم کی دنیا میں 'داخلہ' (انٹرنس) کا مرحلہ ہے اور اب آپ کو طے کرنا ہے کہ کیا آپ محض دنیاوی علم حاصل کرنے پر اکتفا کریں گے یا دینی اور دنیوی علوم کے حصول کو ترجیح دے کر بالغ نظری کا ثبوت دیں گے!

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے قائم کردہ

قرآن کالج لاہور

میں آپ صاف ستھرے ماحول اور دینی فضا میں قرآن کی ہدایت اور عربی زبان کی تحصیل کے ساتھ ساتھ ایف اے اور بی اے کرسکیں گے۔ ایک محدود تعداد میں عمدہ سہولتوں اور دینی تربیت کے ساتھ ہاسٹل کی سہولت بھی موجود ہے ● داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ : ۲۹ جولائی ۹۳ء ، ● انٹرویو: ۳۱ جولائی ● آغاز تدریس ۳ اگست۔ دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں یا خود تشریف لاکر معلومات حاصل کریں

پرنسپل قرآن کالج ، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، فون ۵۸۳۳۶۳۸ / ۵۸۳۳۶۳۷

نوٹ: i) انٹرویو، قرآن کالج میں ۳۱ جولائی کو صبح ۹ بجے ہوگا، جو طلبہ بروقت درخواست داخلہ جمع نہ کراسکیں وہ اپنی درخواست کے ساتھ براہ راست انٹرویو میں شریک ہوسکتے ہیں۔

ii) وسط جولائی تک جن طلبہ کا رزلٹ ڈیکلیئر نہ ہو، وہ بھی داخلے کی درخواست دے سکتے ہیں۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

29/16/36

جلد: ۴۲

شمارہ: ۷

محرم الحرام ۱۴۱۴ھ

جولائی ۱۹۹۳ء

فی شمارہ ۵/-

سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۱۳۰ سعودی ریال یا ۸۰ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۱۰ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۴۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر۔	۹۰ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰- فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرضِ احوال ____________ ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ____________ ۷

پاکستان کی موجودہ سیاست ——— اور
تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کا موقف

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ الہدیٰ (قسط ۸۶) ____________ ۵۹

اہل ایمان کے لئے ابتلاء و آزمائش:
سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں (۳)

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ خطوط و نکات ____________ ۶۸

○ مکتوب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

○ مکتوب فیاض اختر میاں (حماد رفاعی نہیں اکرام ہے)

☆ رفتار کار ____________ ۷۲

○ امیر تنظیم اسلامی کا سہ روزہ دورۂ کراچی

○ دو روزہ تربیت گاہ، کراچی

○ ناظم اعلیٰ پاکستان اور ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان کا دورۂ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

پاکستان کی داخلی سیاسی صورت حال ان دنوں جس درجے ابتری اور بحران کا شکار ہے اسے ضبطِ تحریر میں لانے کی نہ ہم اپنے اندر سکت پاتے ہیں اور نہ ہی اسے بیان کرنے کی کوئی حاجت محسوس ہوتی ہے کہ ہر پاکستانی اس صورت حال سے بخوبی باخبر ہے اور ملک و ملت کا درد رکھنے والا ہر شخص شدید کرب و الم کا شکار ہے۔ "ہارس ٹریڈنگ" کی اصطلاح کو اب "ٹوٹا کرسی" نے دھندلا دیا ہے۔ اور کوئی توہین آمیز اصطلاح اب ایسی باقی نہیں رہی جو ہمارے "معزز ارکانِ اسمبلی" پر برسرِ عام چسپاں نہ کی گئی ہو۔ مزید برآں' اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں محبوس صوبائی ارکان اسمبلی کے طور اطوار اور ان کے مشاغلِ شب و روز کا جو نقشہ اخبارات کے حوالے سے سامنے آتا ہے اسے پڑھ کر نگاہیں شرم سے زمین میں گڑنے لگتی ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے ہاتھوں میں ملکِ خداداد پاکستان کی زمامِ کار ہے!! ہائے کن ہاتھوں میں تقدیرِ حنا ٹھہری ہے ---- ملک کی داخلی صورت حال کے بارے میں تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا جو موقف ہے اس کی واضح عکاسی ان اخباری بیانات اور اجتماعاتِ جمعہ کے پریس ریلیز سے ہو جاتی ہے جو انہی صفحات میں ہدیہ قارئین کئے گئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

رفقاء و احباب اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد کے ڈیڑھ گھنٹے پر محیط خطاب جمعہ کا آخری حصہ' جس کا دورانیہ بالعموم دس تا پندرہ منٹ سے زائد نہیں ہوتا' پاکستان کی سیاسی صورت حال پر تبصرے کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اس مختصر سے وقت میں امیر تنظیم نہ صرف یہ کہ حالات کا تجزیہ سامعین کے سامنے پیش کرتے ہیں بلکہ اصلاحِ احوال کے ضمن میں کچھ مشورے اور ضرورت پڑنے پر بعض معین تجاویز بھی سامعین کے گوش گزار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سامعین میں ایسے لوگ بھی یقیناً موجود ہوتے ہیں جن کی رسائی اوپر تک ہے اور ان کے ذریعہ امیر تنظیم کی بات متعلقہ حلقوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس طرح ارباب حکومت' قائدین قوم اور عوام الناس کی نصح و خیر خواہی کا جو فریضہ ان پر عائد ہوتا ہے' اسے ادا کرنے کی اپنی سی سعی کرتے ہیں۔ تاہم اس محدود وقت میں سیاق و سباق کے بغیر جلدی جلدی میں کی گئی باتوں کو بعض اوقات سامعین صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتے اور اس سے ان کے ذہنوں میں خلجان

پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ملکی سیاسی معاملات کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی اپنی رائے کو مرتب شکل میں اور پوری وضاحت کے ساتھ شرکاء کے سامنے رکھیں تاکہ ان کے سیاسی بیانات اور مشوروں کو اسی تناظر میں دیکھا اور سمجھا جائے۔ گذشتہ ماہ امیر تنظیم اسلامی نے یہ فرض چکا دیا ہے۔ ۲/جون کے اجتماعِ جمعہ میں مسجد دارالسلام لاہور میں امیر تنظیم نے اپنے موقف کو نہایت معین اور دوٹوک لیکن قدرے مجمل انداز میں بیان کیا کہ دین و سیاست کے بارے میں ان کا موقف کیا ہے' سیاست میں حصہ لینا ان کے نزدیک حرام ہے یا فرض و واجب' کیا پاکستان کو ایک اسلامی ریاست قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر نہیں تو اس کے سیاسی امور کے ضمن میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے وغیرہ۔ پھر قرآن اکیڈمی کراچی میں ۹/جون کے اجتماع میں یہ موضوع زیرِ گفتگو رہا اور پھر پوری تفصیل کے ساتھ اس پر ۱۶/جون لاہور کے اجتماعِ جمعہ میں گفتگو ہوئی۔ قبل ازیں رفقاءِ تنظیم کے اجتماعات میں ان امور پر گاہے بگاہے گفتگو ہوتی رہی ہے لیکن اتنی وضاحت کے ساتھ یہ بات یکجا کسی ایک موقع پر بیان نہیں ہوئی تھی۔ ان تینوں خطابات کو مرتب کر کے زیرِ نظر شمارے میں شائع کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات بھی رہ نہ جائے تاکہ تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا موقف پوری وضاحت کے ساتھ رفقاء و احباب کے سامنے آسکے۔ بحمد اللہ کہ ہم ان تینوں خطابات کو مرتب کر کے اسی شمارے میں قارئین کی نذر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں' لیکن ہماری اس کوشش کے نتیجے میں ایک تو یہ کہ یہ خطاب غیر معمولی طور پر طویل ہو گیا ہے کہ 'میثاق' کے ساڑھے باون صفحات پر محیط ہے اور دوسرے یہ کہ اس شمارے کی اشاعت میں بھی قدرے تاخیر ہو گئی ہے' تاہم ہمیں امید ہے کہ اس خطاب کی خصوصی اہمیت کے پیشِ نظر ہماری یہ دونوں تقصیرات قابلِ عفو سمجھی جائیں گی۔

پریس ریلیز

لاہور' ۲ جولائی۔ تنظیم اسلامی کے امیر اور تحریکِ خلافت پاکستان کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ہمارے ملکی حالات خرابی کی اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں کہ اب اگلا مرحلہ فنا کے گھاٹ پر اتر جانا ہی ہو سکتا ہے۔ مسجد دارالسلام' باغ جناح کے اجتماعِ جمعہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا پچھلے چند دنوں میں خانہ جنگی کے آغاز میں صرف ٹریگر دبانے کی کسر رہ گئی تھی جو اگر شروع ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ بات کہاں جا کر ختم ہوتی۔ تاہم ڈاکٹر

اسرار احمد نے امید ظاہر کی کہ یہ کڑا وقت بھی ان شاء اللہ ٹل جائے گا کیونکہ پاکستان کے قیام اور بقاء میں خصوصی مشیتِ ایزدی کا دخل ہے' لیکن ہمیں بہرحال اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب بھی وقت ہے کہ ہمیں جو مہلت مل رہی ہے اسے غنیمت جان کر قومِ یونسؑ کی طرح اجتماعی توبہ کرلیں۔ کیا عجب کہ عذابِ الٰہی کے یہ بادل مستقل طور پر چھٹ جائیں اور ہم اپنی کھوئی ہوئی منزل کی راہ پر گامزن ہوجائیں۔ انہوں نے تمام لوگوں سے اپیل کی کہ خلوص نیت اور پختہ ارادے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور ملک کو نت نئے بحرانوں سے نجات دلانے کے لئے کمرِ ہمت کسیں' یہی ایک طریقہ ہے اپنے آپ کو اس مصیبت سے بچانے کا۔

اس موقع پر جنرل (ریٹائرڈ) ایم - ایچ انصاری نے بھی مختصر طور پر اجتماع سے خطاب کیا۔ انہوں نے ملک کے حالات کی نزاکت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ کل ہمارے شہر میں دو گورنر' دو چیف سیکرٹری' دو آئی جی اور دو مسلح تنظیمیں الگ الگ احکامات کی تعمیل میں کوشاں تھیں اور دونوں کے درمیان تصادم تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ جنرل انصاری نے کہا کہ اسے دیکھ کر مجھ پر جو پریشانی طاری ہوئی عام لوگ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے' کیونکہ سقوطِ ڈھاکہ سے قبل کے اڑھائی برس کا بدامنی کا دور مشرقی پاکستان میں میرے سامنے گزرا ہے' جس کا انجام پاکستان کے دولخت ہونے کی صورت میں ہوا۔ لوگ اُس وقت بھی یہی کہتے تھے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں' پاکستان اللہ نے بنایا ہے وہی اسے بچائے رکھے گا۔ جنرل انصاری نے ڈاکٹر اسرار احمد کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بچاؤ کی وہی ایک شکل ہے جو ڈاکٹر صاحب ایک عرصے سے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جنرل انصاری نے کہا کہ میں ملک کے حالات میں اصلاح کی غرض سے ملازمت سے فارغ ہوکر جمعیت علمائے پاکستان میں سات سال تک پورے خلوص اور احساسِ امانت و دیانت کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں مگر اس کے باوجود کہ میرے نزدیک مذہبی جماعتوں میں اب بھی یہ سب سے بہتر سیاسی جماعت ہے' میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نظام کو بدلے بغیر ملک و قوم کی تقدیر نہیں بدلی جاسکتی اور مروّجہ سیاست اور انتخابی جدوجہد کے ذریعے نظام کی تبدیلی ہرگز ممکن نہیں' لہٰذا میں نے اپنی بچی کھچی توانائیاں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنظیم اسلامی کو پیش کر دی ہیں جو انقلابی جدوجہد کے ذریعے نظام کو بدلنے اور خلافت کے قیام میں یقین رکھتی ہے۔

اجتماع میں ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک قرارداد پیش کی' جسے حاضرین نے ہاتھ اٹھا کر متفقہ طور پر منظور کیا۔ مذکورہ قرار داد میں ۱۸ جون کی ایک مقامی اخبار کی اس اطلاع پر تشویش اور غم و غصے کا اظہار کیا گیا جس کے مطابق وٹو حکومت نے وفاقی محکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام ٹی وی کی

مخاصمانہ پالیسی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہانگ کانگ کے سٹار ٹی وی سے وقت خریدا ہے اور اس کے ذریعے عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لئے یونین کونسل کی سطح پر ڈش انٹینا خرید کر دینے کا منصوبہ بنایا ہے، جس پر بارہ ارب روپے خرچ ہوں گے۔ قرارداد میں اس منصوبے کی مذمت کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا گیا کہ اس تمام خرچ سے صرف فحاشی اور بے حیائی کو فروغ ہوگا جو شہروں کی حد تک پہلے ہی اخلاقی قدروں کی تباہی کا موجب ثابت ہوئی ہے، نیز اس سے قادیانیوں کے مرزا طاہر احمد کے ہفتہ وار خطاب بھی عام مسلمانوں تک پہنچنے لگیں گے جو روسی مواصلاتی سیارے کے ذریعے اِس وقت نشر ہو رہے ہیں۔ وٹو صاحب کے والد کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ باقاعدہ قادیانی مبلغ ہیں، اگرچہ خود وزیر اعلیٰ وٹو صاحب اپنے بارے میں اعلانِ براءت کرتے ہیں لیکن اس کا امکان رد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بزرگوں کی خوشنودی کے حصول کی سعادت بھی حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

(۲)

امیر تنظیم اسلامی پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ نواز شریف صاحب کی حکومت سیاسی بحران کو عدالتی فیصلوں کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش میں بہت قیمتی وقت ضائع کر رہی ہے جس کے دوران ملک و قوم کا نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھا جائے اور فوری طور پر سب کی سب موجودہ اسمبلیوں کو توڑ کر نئے عام انتخابات کا اعلان کر دیا جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ میں اب بھی وہی بات دہراتا ہوں جو ایک عرصے سے کہتا آ رہا ہوں کہ نئے الیکشن کو آزادانہ اور منصفانہ رکھنے کے لئے اعلیٰ عدالتوں کے ان غیرجانبدار ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل نگران حکومتیں بنائی جائیں جو متحارب سیاسی فریقوں میں سے کسی بھی فریق کے ساتھ نظریاتی یا عملی وابستگی نہ رکھتے ہوں لیکن تازہ صورت حال میں میرا اضافی مطالبہ یہ ہے کہ غلام اسحاق خاں سے بھی مسندِ صدارت خالی کرائی جائے کیونکہ نواز شریف صاحب کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ ان کی ذات بہت متنازعہ بن چکی ہے اور پچھلے الیکشن میں بھی انہوں نے اچھی شہرت نہیں کمائی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کردار کی تعریف کی جو پاک فوج نے موجودہ بحران میں اب تک ادا کیا ہے اور توقع ظاہر کی کہ یہ قومی ادارہ ملکی سیاست کی گاڑی کو پھر سے پٹڑی پر ڈال کر گذشتہ چند برسوں میں کمائی ہوئی اپنی نیک نامی میں اضافہ کرے گا۔ فوج کو ہی اب صدر اسحاق سے استعفاء طلب کرکے آئین کے مطابق سینٹ کے چیئرمین کو قائم مقام صدر بننے کی راہ ہموار کرنی چاہئے اور مجوزہ انتخابات کے انتظامات میں اس حد تک حصہ بھی ضرور لینا چاہئے جس کے نتیجے میں صاف ستھرے نتائج کو ممکن حد تک یقینی بنایا جاسکے۔

پاکستان کی موجودہ سیاست
اور
تنظیمِ اسلامی اور تحریکِ خلافت کا موقف

ڈاکٹر اسرار احمد کا خطابِ جمعہ

معزز حاضرین و محترم خواتین! یہ بڑی غیر معمولی سی بات ہے کہ آج ہم نے خطاب جمعہ کے لئے خالص سیاسی عنوان معین کیا ہے یعنی "پاکستان کی موجودہ سیاست اور تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کا موقف"۔ آج کی گفتگو کے لئے اس عنوان کو معین کرنے کا سبب یہ ہے کہ بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ میرا خطابِ جمعہ اصلاً تو قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے مختلف دینی موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے لیکن صرف آخر میں اختصار کے ساتھ ملکی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ان پر تبصرہ ہوتا ہے' کیونکہ اپنے ملکی و ملی معاملات سے بھی ہم بالکل صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اس طرح کم وقت میں اختصار کے ساتھ اور جلدی میں جو بات کہی جاتی ہے وہ پورے طور پر واضح نہیں ہوتی۔ لہٰذا ہمارے بہت سے بہی خواہ' متفقین اور معاونین حضرات بھی کچھ الجھ جاتے ہیں اور بہت سے پرانے رفقاء کی سمجھ میں بھی بات پورے طور پر نہیں آتی۔ پھر ظاہر بات ہے کہ مخالفین کو تو ایسا موقع مطلوب ہوتا ہے کہ ایسی کوئی صورت ہو جس کو وہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں۔ لہٰذا میری خواہش یہ ہے کہ آج اس موضوع پر اپنا نقطۂ نظر پورے دلائل کے ساتھ' نپے تلے الفاظ میں ذرا تفصیل سے پیش کر دوں' تاکہ اس ضمن میں ہمارا جو موقف ہے اس کا نہ صرف یہ کہ صغریٰ کبریٰ پوری طرح واضح ہو جائے بلکہ جیسا کہ سورۃ الانفال کی آیت ۸ میں الفاظ آئے ہیں : "لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ" یعنی "تاکہ اللہ حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دے" اسی طرح

ہمارا موقف بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے۔ پھر جسے اس سے اختلاف ہو وہ علیٰ وجہ البصیرت اختلاف کرے' کسی مغالطے یا غلط فہمی کی بناء پر نہ کرے۔ اس لئے کہ اختلاف تو ہرحال میں ہو سکتا ہے' ہر شخص کی رائے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ میں اگر دوسروں کی آراء سے اختلاف کرتا ہوں تو دوسروں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ مجھ سے اختلاف کریں۔ لیکن وہ اختلاف وضاحت کے ساتھ ہو کہ آپ کی فلاں بات کو ہم درست نہیں سمجھتے' لہٰذا اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ سورۃ الانفال ہی کی آیت ۴۲ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: "لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ" یعنی "تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ حجت قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ رہے"۔ یعنی جسے ہلاک ہی ہونا ہے وہ بھی بات کے واضح ہونے کے بعد' جانتے بوجھتے ہلاک ہو۔ وہ اگر حق کو قبول نہیں کرنا چاہتا تو بھی یہ بات اس پر منکشف ہو جائے کہ حق تو یہ ہے' میں اگر اسے قبول نہیں کر رہا تو اپنے تمرد' اپنے تکبر' اپنی سرکشی اور اپنے حسد کی وجہ سے نہیں کر رہا۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ رہے یعنی جسے اتفاق کرنا ہو وہ بھی علیٰ وجہ البصیرت اتفاق کرے' مبہم سا اتفاق نہ ہو۔ جسے بات قبول کرنی ہے وہ محض اس وجہ سے قبول نہ کرے کہ چونکہ فلاں شخص کی بات ہے لہٰذا قبول کر رہا ہوں' فلاں سے مجھے محبت ہے اس لئے اس کی تو ہر بات میرے لئے واجب الاطاعت ہے۔ یوں نہیں' بلکہ جس شے کو قبول کرے دلیل کی بنیاد پر اور علیٰ وجہ البصیرت قبول کرے۔ مبہم اور غیر واضح اتفاق اشتراکِ عمل کو جنم نہیں دیتا۔ واضح اتفاق ہو تو پھر آدمی صحیح طور پر ساتھ دیتا ہے' ہم سفر بنتا ہے' دست و بازو بنتا ہے' انصار و اعوان میں شریک ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے میں نے ان آیات کا حوالہ دیا ہے۔

تاہم یہ نہ سمجھئے کہ میری یہ گفتگو خالص سیاسی ہو گی' بلکہ فی الاصل یہ دینی گفتگو ہے۔ صرف ترتیب بدل جائے گی کہ پہلے ہم دینی نصوص' قرآن و سنت سے بات شروع کر کے اسے ملکی حالات تک پہنچاتے تھے' آج ترتیب برعکس ہو گی' لیکن بات وہی رہے گی۔ حق تو ایک حقیقتِ واحدہ ہے' اس میں آپ کسی بھی دروازے سے داخل ہو جائیں' کسی بھی ترتیب سے رسائی حاصل کر لیں' وہ تو حق ہی ہے۔

دین اور سیاست

اس تمہید کے بعد جو سب سے پہلی بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سیاست کے بارے میں ہمارا موقف کیا ہے۔ آیا سیاست کا دین سے کوئی تعلق ہے یا نہیں ہے؟ سیاست میں حصہ لینا گناہ ہے؟ یا واجب یا فرض ہے؟ اس بارے میں ہمیں پورے طور سے صحیح رائے قائم کرنی چاہئے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں میں پانچ باتیں عرض کروں گا۔

پہلی بات یہ کہ اسلام میں سیاست شجرِ ممنوعہ نہیں' یہ کوئی گناہ یا معصیت کا کام نہیں' بلکہ اسلام چونکہ دین ہے اور مذہب اور سیاست دونوں کا جامع ہے' اس لئے سیاست اسلام کا جزوِ لاینفک ہے۔ یہ اس کا لازمی حصہ ہے جو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس فکر کو از سرِ نو علامہ اقبال نے جس قوت سے پیش کیا اس پر ہم ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت کی انہوں نے ان دو اشعار میں بہت صحیح تعبیر کی ہے کہ ۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور ۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

اسلام میں تو دین و دولت ایک ہیں' مذہب اور سیاست ایک ہیں۔ چنانچہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک سیاست کوئی دنیاداری کا فعل نہیں ہے بلکہ یہ تو دین کا جزو ہے۔ ہمارے نزدیک تو مسلمانوں کے زوال اور اضمحلال کا سب سے بڑا مظہر ہی یہ ہے کہ سیاست اور مذہب علیحدہ ہو گئے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد سے تدریجاً یہ علیحدگی شروع ہوئی اور چند صدیوں کے اندر اندر بالکل علیحدہ علیحدہ خانے بن گئے کہ یہ اہلِ سیاست و حکومت ہیں اور یہ رجالِ دین ہیں۔ بعد میں اہلِ دین میں مزید تقسیم ہو گئی کہ یہ علماء ہیں اور یہ صوفیاء ہیں۔ اس طرح عالمِ اسلام میں قیادت کی تثلیث قائم ہو گئی۔ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی تثلیث کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری

چنانچہ مسلمانوں کی قیادت تین حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک طرف ملا یعنی علماء، دوسری طرف پیر یعنی صوفیاء اور تیسری طرف بادشاہ یعنی سلاطین و ملوک۔ یوں یہ تثلیث وجود میں آ گئی، جبکہ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں یکجا ہوں، جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں تھا۔ مسلمانوں کی قیادت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں تھی تو وہ ایک بہت بڑے عالم بھی تھے، وہی مسجدِ نبوی کے خطیب اور امام تھے اور وہی مسلمانوں کے سیاسی سربراہ یعنی امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین بھی تھے۔

دوسری بات یہ کہ اگر اسلامی ریاست بالفعل موجود ہو، اسلام کا نظام اجتماعی عملاً قائم ہو تو اس کی سیاست نہ صرف عبادت ہے بلکہ کارِ نبوت ہے۔ یہ بات میں بغیر دلیل کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے ہر دعوے کی دلیل میرے پاس موجود ہے۔ میری دو آنکھیں اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسولؐ کے فرامین ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **"كَانَتْ بَنُو اِسرائيل تَسُوسُهُمُ الأَنبِياء، كُلّما هلك نَبِيٌّ خلفهٗ نبيٌّ"** یعنی بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھوں میں تھی، جیسے ہی کوئی نبی فوت ہوتا تھا اس کا جانشین بھی نبی ہوتا تھا۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے) چنانچہ سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک نبوت کا یہ تار ٹوٹا ہی نہیں۔ یہ چودہ سو برس ایسے ہیں کہ دنیا میں ایک ہی نسل میں نبوت کا سلسلہ چلتا رہا اور ہر وقت ایک نہ ایک نبی ان کے مابین موجود رہا۔ پھر اس میں سیاست اور نبوت کا جو امتزاج ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ وقت کا نبی ہی ان کا سربراہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب حکومت قائم ہو گئی تو حضرت داؤد علیہ السلام نبی بھی تھے اور بادشاہ اور خلیفہ بھی تھے۔ پھر ان کے وارث ہوئے حضرت سلیمان علیہ السلام، تو وہ بھی نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ یہاں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبوت اور سیاست، یعنی بادشاہت اور نبوت گویا کہ ایک جسدِ واحد بن گئے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کی سیاست محض عبادت ہی نہیں، کارِ نبوت ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر تیسری بات یہ کہ غیر اسلامی نظام حکومت میں بھی کسی مسلمان

کا' اس کی طلب کے بغیر' مقتدر یا مقتدرین کی جانب سے حکومت کے پیشکش پر اس منصب کو قبول کرنا جائز ہی نہیں بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ ایک استثنائی صورت ہے جس کی مثال سنتِ یوسفی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ مصر میں اُس وقت اسلامی نظام قائم نہیں تھا۔ نہ وہاں کے لوگ آپؑ پر ایمان لائے تھے اور نہ بادشاہِ وقت' لیکن وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معتقد ہو گیا تھا کہ یہ بہت نیک آدمی ہے' پاک دامن ہے' اس پر جو الزام لگا تھا جھوٹا ثابت ہوا' اسے ناحق جیل میں ڈالا گیا' پھر اتنا ذہین و فطین اور سمجھ دار انسان ہے کہ اس نے میرے خواب کی نہ صرف صحیح صحیح تعبیر بتا دی اور متنبہ کر دیا کہ کتنی بڑی مصیبت آنے والی ہے' سات سال کا عظیم قحط پڑنے والا ہے' بلکہ اس سے بچاؤ کا طریقہ بھی بتا دیا تو بادشاہ جو مقتدرِ مطلق تھا' وہ ذاتی طور پر حضرت یوسفؑ کا معتقد ہو گیا' چنانچہ حضرت یوسفؑ نے وہاں عوام کی بہبود کی خاطر ایک عہدہ قبول کر لیا۔ اس سے میں جو نتیجہ نکال رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس قسم کے استثنائی حالات میں غیر اسلامی نظام حکومت میں کوئی عہدہ قبول کر لینا قطعاً حرام نہیں ہے۔ لیکن اس کے لئے شرطیں کیا ہیں؟ یہ کہ اس کے لئے آپ نے نہ صرف یہ کہ کوئی جوڑ توڑ اور سازش نہ کی ہو بلکہ خود کوئی جدوجہد نہ کی ہو' اس کے برعکس جو مقتدر شخص یا لوگ ہوں وہ خود آپ سے متاثر ہو کر پیشکش کریں کہ آیئے' یہ منصب سنبھالئے۔ پھر معاملہ بھی کسی قومی یا اجتماعی مسئلے سے متعلق ہو' عوام کی بہبود کا ہو' کہ اگر اس معاملے کو صحیح طور پر حل نہ کیا گیا تو قیامت واقع ہو جائے گی' ملک برباد ہو جائے گا اور لاکھوں انسان فاقوں سے مر جائیں گے۔ اس طرح کی صورت حال میں حضرت یوسف علیہ السلام نے وہ منصب سنبھال کر اس طرح کا بندوبست کیا کہ خوشحالی کے سات سالوں میں غلہ ذخیرہ کیا جو قحط سالی کے سات سالوں میں کام آیا۔ چنانچہ اس طرح کے استثنائی حالات میں غیر اسلامی حکومت میں بھی کوئی ذمہ داری قبول کر لینا جائز ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اگر نظامِ حکومت غیر اسلامی ہو تو اقتدار کی رسہ کشی میں شریک ہو کر' اس کے لئے خود جدوجہد کر کے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنا میرے نزدیک ناجائز ہی نہیں حرام کے درجے میں ہے۔ یہاں "حرام" کا لفظ میں فقہی اعتبار سے نہیں' بلکہ اس کی حقیقی روح کے اعتبار سے استعمال کر رہا ہوں۔ یہ چیز کسی بھی درجے میں

اسلام میں پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔ فقہی اعتبار سے بھی اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو چاہے حرامِ مطلق نہ ہو' مکروہِ تحریمی تو قرار پائے گی۔ خاص طور پر جبکہ اس کے لئے کچھ جوڑ توڑ بھی کرنے پڑیں' اپنے اصولوں کی قربانی بھی دینی پڑے' بہت سے اصولوں پر مفاہمت اور Compromise بھی کرنا پڑے بہت کچھ اونچ نیچ بھی کرنی پڑے' کوئی دائیں بائیں کے حربے بھی اختیار کرنے پڑیں تو یوں سمجھئے کہ اس میں خباثت پر خباثت کا اضافہ ہو گیا' لہٰذا یہ حرام در حرام ہے۔ اور اس کی حرمت کا فتویٰ عالم عرب کے بہت سے علماء نے دیا ہے۔ اس کے لئے ان کے پاس دلیل یہ ہے کہ اگر نظامِ حکومت غیر اسلامی ہے تو دستور بھی غیر اسلامی ہو گا۔ اب اگر کوئی شخص الیکشن لڑ کر پارلیمنٹ میں جاتا ہے تو سب سے پہلے اسے اس غیر اسلامی دستور کا حلف اٹھانا پڑے گا اور غیر اسلامی دستور کا حلف اٹھانا حرام ہے۔ ویسے تو ایک عام شہری جو غیر اسلامی دستور والے ملک میں رہتا ہے وہ بھی ایک اعتبار سے گناہ گار ہے۔ لیکن وہ اس طرح کھڑا ہو کر حلف نہیں اٹھاتا جس طریقے سے وزراء اور ارکانِ اسمبلی دستور سے وفاداری کا حلف استوار کرتے ہیں۔

پانچویں بات یہ کہ اسلامی ریاست میں' عوام کی بہبود کے لئے' نظامِ مملکت کو بہتر طور پر چلانے کے لئے' یا اسلام کی خدمت کے لئے' انتخابات میں حصہ لینا اور آگے بڑھ کر ذمہ داریاں سنبھالنا یقیناً ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ تو کارِ ثواب اور کارِ عبادت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی اصولی طور پر واضح رہنی چاہئے کہ اپنی ذات کے لئے اقتدار کی خواہش کرنا قطعاً حرام ہے۔ اس کا تعلق انسان کی نیت سے ہے جس کا فیصلہ میں اور آپ نہیں کر سکتے۔ تاہم اپنی ذات کے لئے اقتدار کی خواہش اور سربلندی کی طلب نصِ قرآنی کی رُو سے حرام ہے۔ سورۃ القصص کی آیت نمبر ۸۳ میں فرمایا گیا:

"تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ"

"یہ آخرت کا گھر (یعنی جنت) تو ہم نے ان لوگوں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے جو نہ تو زمین میں اپنے لئے سربلندی (اقتدار و اختیار) کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فتنہ و فساد کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور عاقبت تو ہے ہی پرہیزگاروں کے لئے"۔

اس لئے کہ یہ طلبِ حکومت اور طلبِ اقتدار ہی ہے جو فساد پیدا کرتی ہے۔ فتنہ و فساد

درحقیقت اقتدار کی کشاکش یا پاور پالیٹکس ہی سے جنم لیتا ہے۔ تو آخرت کا گھر تو مخصوص ہی ان لوگوں کے لئے ہے جو اس میدان میں قدم ہی نہ رکھیں۔ البتہ جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر نیت عوام کی بہبود کی ہو تو پھر حکومتی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے تگ و دو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کسی دور میں جو یہ کہا گیا کہ "امیدواری حرام ہے" تو میرے نزدیک یہ بھی شدت پسندی ہے۔ اصل میں امیدواری کا معاملہ انسان کی نیت پر منحصر ہے۔ اگر انسان کی نیت یہ ہو کہ میں اسلام کی خدمت کے لئے اور عوام کی بہبود کے لئے اسلامی نظام کو بہتر انداز سے چلانے کے لئے ذمہ داری قبول کرنا چاہتا ہوں تو اس میں حرام والی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ واضح رہے کہ یہاں بات اسلامی ریاست کی ہو رہی ہے' یعنی وہ جگہ جہاں اسلامی نظام پہلے سے قائم ہو۔

پاکستان کے معروضی حالات

سیاست کے بارے میں پانچ بنیادی نکات کی صراحت کے بعد اب ہمیں پاکستان کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر معین کرنا ہو گا کہ اس تناظر میں پاکستان کی حقیقت کیا ہے۔ یہاں بھی پانچ ہی باتیں مدِ نظر رکھنی ہوں گی۔

پہلی بات تو یہ کہ پاکستان ایک مسلمان ملک تو ہے' اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہے۔ اسے اسلامی ریاست بنانے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ تحریک پاکستان کے دنوں میں مولانا مودودی مرحوم نے یہ بات بڑے زوردار انداز میں کہی تھی کہ تم ایک "قومی تحریک" لے کر چل رہے ہو جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی "قومی ریاست" تو قائم ہو جائے گی' ایک "اسلامی ریاست" ہرگز قائم نہیں ہو گی۔ اور آج کی تاریخ تک تو ہم نے مولانا مرحوم کے اس قول کو صحیح ثابت کیا ہے۔

اُس وقت ایک رائے یہ تھی کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کا ملک وجود میں آ جائے تو وہاں پر اسلامی ریاست قائم کرنا آسان ہو گا۔ اب مستقبل میں تو شاید کہ ہم یہ کر گزریں اور اس طرح تحریکِ پاکستان کا موقف درست ثابت ہو جائے لیکن تاحال تو یہ بات پوری طرح صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک قومی ریاست تو وجود میں آ گئی ہے لیکن اس پر "اسلامی ریاست" کا لیبل چسپاں کرنا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں! یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ دنیا

میں اِس وقت پچاس ساٹھ مسلمان ممالک ہیں جہاں نام کے مسلمان یقیناً اکثریت میں ہیں' لیکن ان میں سے کسی کو بھی اسلامی ریاست نہیں کہا جا سکتا۔

دیگر مسلم ممالک کی طرح پاکستان بھی مسلمانوں کا ملک تو ہے' لیکن اسلامی ریاست نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے' مسجدیں محفوظ ہیں اور ایودھیا کی بابری مسجد کی طرح یہاں کوئی مسجد گرائی نہیں جا سکتی' لیکن اسلامی نظام یہاں قائم نہیں۔ بلکہ نظام تو بہت بڑی بات ہے یہاں کے قوانین تک اسلامی نہیں ہیں اور اسلامی حدود و تعزیرات تک نافذ نہیں ہیں۔ یہاں چوری کرنے پر کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا' زانی کو سنگسار نہیں کیا جاتا' کوڑے نہیں لگائے جاتے' نہ نظامِ صلوٰۃ قائم ہے اور نہ وہ نظامِ زکوٰۃ کہ جس میں تمام اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ لازماً وصول کی جائے اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات اور معاشی کفالت کا ذمہ لیا گیا ہو۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ جس نظامِ معیشت کے رگ و پے اور ریشے ریشے میں سود سرایت کئے ہوئے ہو' کیا اسے اسلامی نظام کہیں گے؟ ——— پھر حقیقت یہ ہے کہ ہمارا قومی مزاج بھی سیکولر ہے۔ میں صرف لیڈروں یا سرمایہ داروں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہا' بلکہ معاشرے کا عام رجحان سیکولر ہے' ہمارے عوام کی اکثریت کا مزاج بھی سیکولر ہے۔ وہ مذہب کو نماز روزے تک محدود رکھتے ہیں' باقی کاروبارِ دنیوی میں حلال حرام کی پرواہ کسی کو بھی نہیں ہے۔

قومی مزاج کے سیکولر ہونے کی شہادت حاصل کرنی ہو تو ہر شخص اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لے۔ ایک طرف ہمارے ایمان کی سطح اتنی نیچی ہے کہ صرف عقیدہ ہے' ایمان نہیں۔ ہر شخص سوچ لے کہ ایک طرف ایمان ہو اور دوسری طرف مفاد ہو تو وہ کدھر جائے گا' مفاد کو ترجیح دے گا یا ایمان کو؟ یہ اس کے ایمان کا لٹمس ٹیسٹ (Litmus Test) ہے۔ سیدھی سی بات ہے' ہر شخص ذاتی محاسبہ کرے کہ پیسے میں زیادہ وزن ہے یا اللہ کے حکم میں؟ آج اچھے بھلے مسلمان لوگ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ اجی سود حرام ہو گا لیکن اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ آج تو ییلو کیب اور خود روزگار سکیم چلا کر نواز شریف صاحب نے ہمیں سود کا صرف قائل ہی نہیں کیا بلکہ اس کا بہت بڑا ایڈووکیٹ بنا دیا ہے۔ عام لوگ اب اس نہج پر سوچنے لگے ہیں کہ اگر سود کے ذریعے سے ہمیں یہ نعمت مل رہی ہے تو حرمت کا فتویٰ تم لے کر بیٹھو اپنے گھروں کے اندر' ہمارے مسائل کو بھی

کسی نے حل کیا آج تک! ـــــ کیا ہمارا معاشرہ اسی رخ پر نہیں جا رہا جو خالص سیکولر نقطۂ نظر ہے۔

پاکستان کے بارے میں دوسری بات یہ کہ اس کی وجہِ جواز بھی صرف اسلام تھی اور اس کی بقاء اور اس کے دوام و استحکام کی بنیاد بھی صرف اسلام ہے۔ میں نے اپنی تالیف استحکامِ پاکستان میں اس پر وضاحت سے لکھا ہے کہ ہندوستان کی یہ تقسیم باقی ہر اعتبار سے مصنوعی اور غیر فطری ہے اور اس کے لئے سوائے مذہب کی بنیاد کے اور کوئی بنیاد سرے سے موجود نہیں ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ غیر فطری ہے' کیونکہ مشرقی پنجاب کا سکھ بھی پنجابی بولتا ہے اور مغربی پنجاب کا مسلمان بھی پنجابی بولتا ہے۔ نسلی اعتبار سے بھی اس کی کوئی بنیاد نہیں بنتی' کیونکہ وہی جاٹ سکھ ہے اور وہی جاٹ مسلمان ہے۔ ایک ہی راجپوت نسل ہے' مسلمان بھی راجپوت ہے اور ہندو بھی راجپوت ہے۔ وہی شیخ مسلمان ہو گئے تو شیخ کہلاتے ہیں اور ہندو ہیں تو بنئے کہلاتے ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ تقسیم غیر فطری اور غیر منطقی ہے۔ زمینی تقسیم اس طرح کی گئی کہ دریا بھی کاٹ دیئے گئے۔ ہمارے اور بھارت کے درمیان کوئی فطری سرحد موجود نہیں۔ بھارت نے تو سینکڑوں میل تک تار لگا کر اس میں بجلی کا کرنٹ دوڑایا ہے ورنہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کوئی حقیقی رکاوٹ ہے ہی نہیں۔ تو لسانی' نسلی اور جغرافیائی' ہر اعتبار سے پاکستان کا قیام بلاجواز ہے' اور اس کے لئے سوائے اسلام کے اور کوئی وجہِ جواز نہیں۔ یہ ملک دو قومی نظریئے کی بنیاد پر قائم ہوا' یعنی ہمارا نظام' ہمارا قانون' ہماری تہذیب اور ہمارا تمدن ہندو سے بالکل مختلف ہے اور ہماری قومیت کی بنیاد ہمارا مذہب ہے۔ چنانچہ تحریک پاکستان کا نعرہ یہی تھا "پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!" ـــــ اور اس سے بھی بڑھ کر' صد فی صد درست بات یہ ہے کہ اس کی بقا اور استحکام بھی صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ اگر مستحکم ہو سکتا ہے تو صرف اسلام کی بنیاد پر' ورنہ اس کو مستحکم کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ دنیا کی دوسری مسلمان قومیں بغیر اسلام کے بھی زندہ رہ سکتی ہیں' لیکن پاکستان بغیر اسلام کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر ترکی ایک مسلمان ملک ہے جس میں ۸۰ فی صد لوگ ترک ہیں اور ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ تو لسانی اور نسلی وحدت انہیں جمع رکھ سکتی ہے۔ مگر ہمیں کیا چیز جمع کرے گی؟ ہمیں مجتمع رکھنے والی کوئی شے

اسلام کے سوا ہے ہی نہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر۔

"اپنی مِلت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِؐ ہاشمی"

پاکستان پر تو صد فی صد منطبق ہوتا ہے' جبکہ کسی دوسرے مسلمان ملک پر اس شعر کا بتمام و کمال انطباق نہیں ہوتا۔

تیسری بات کہ اگر یہاں اسلام نہ آیا تو یہ ملک اپنا جواز کھو دے گا' لہٰذا یہ قائم نہیں رہے گا اور اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جو چیز اپنا جواز کھو دے وہ ہو سکتا ہے کچھ دن دوسروں کے سہارے' دوسروں کی مصلحتوں کی وجہ سے باقی رہ جائے' لیکن آخرکار قائم نہیں رہ سکتی۔ صرف وقت کا معاملہ ہے کہ اس کے ٹوٹنے یا ختم ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ مشرقی پاکستان تو آج سے بائیس برس قبل بنگلہ دیش بن چکا۔ یہ باقی کا بچا کھچا پاکستان بھی اسلام کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا' بلکہ اس کے کئی ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اگر بے نظیر صاحبہ اور ان کی پارٹی اس ملک کو سیکولر ملک بنانا چاہتی ہیں تو یہ گویا اس ملک کی نفی ہے۔ وہ اگر یہ سمجھتی ہیں کہ سیکولرزم کی بنیاد پر یہ ملک مستحکم ہو جائے گا تو یہ قطعاً ناممکن ہے ع "ایں خیال است و محال است و جنوں!" وہ دراصل پاکستان کے Genesis سے واقف نہیں۔ انہوں نے چاندی کا بلکہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر آنکھ کھولی ہے۔ وہ پاکستان میں اقتدار کے ایوانوں میں ضرور گھومی پھری ہیں لیکن انہیں کیا پتہ کہ یہ ملک کس طور سے بنا تھا' کن کی قربانیوں سے بنا تھا' کن نعروں سے بنا تھا۔ اسی طریقے سے اگر نواز شریف صاحب یا ان کے ساتھیوں کا یہ خیال ہو کہ ہم اس ملک کو کوریا بنا دیں گے' یا ہانگ کانگ یا سنگاپور بنا دیں گے اور اس سے یہ ملک مستحکم ہو جائے گا تو یہ بھی پرلے درجے کی احمقانہ بات ہے۔ یہ چیز بھی اس ملک کے استحکام کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ اس ملک کا جواز بھی اسلام سے ہے اور اس کے استحکام کی واحد بنیاد بھی اسلام ہے۔

چوتھی بات یہ کہ جب اس ملک کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کا ملک تو ہے' اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہے تو اب یہاں سیاست کی کیا حیثیت ہے۔ اس میں حصہ لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ اس کا تجزیہ بھی میں نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں کیا ہے۔ دراصل سیاست کے دو حصے ہیں: (i) نظری سیاست اور (ii) عملی سیاست۔

نظری سیاست یہ ہے کہ ملک اور قوم کے حالات و مسائل پر غور و فکر کیا جائے' اس کے بارے میں سوچ سمجھ کر صحیح رائے قائم کی جائے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ نظری سیاست ملک کے ہر باشعور شہری کا فرض ہے اور ہر باشعور مسلمان کا تو فرضِ عین ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک باشعور مسلمان اپنے آپ کو اس سے منقطع کر لے۔ یہ گویا سیاست کا ۵۰ فیصد ہے۔ اس نظری سیاست میں سب سے بڑا حصہ صحافی حضرات لیتے ہیں جبکہ انہیں "سیاستدان" کوئی نہیں کہتا۔ وہ لوگوں کی سوچ کا رخ معین کرتے ہیں' ان کی رائے بناتے ہیں لیکن وہ سیاست دان نہیں ہیں۔ یہود ساری دنیا پر' خاص طور سے امریکہ پر ذرائع ابلاغ ہی کی وجہ سے چھائے ہوئے ہیں۔ ٹیلی ویژن ہو یا پریس' تمام ذرائع ابلاغ ان کے قبضے میں ہیں' اور اسی وجہ سے وہ پوری امریکی قوم کی سیاست کا رخ معین کرتے ہیں' بقولِ اقبالؒ "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!" میں خود نظری سیاست کا نہ صرف قائل ہوں بلکہ اس میں خود حصہ لیتا رہا ہوں' ہماری تنظیم اسلامی بھی اس میں بھرپور حصہ لیتی رہی ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کو اس میں حصہ لینا چاہئے۔

البتہ سیاست کا دوسرا حصہ عملی سیاست ہے۔ اس عملی سیاست کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیجئے۔ عملی سیاست کا ایک پہلو ہے ملک میں جو نظام قائم ہے اسے چلانے کے لئے سیاست۔ جبکہ اس کا دوسرا پہلو ہے موجودہ نظام کو غلط سمجھتے ہوئے اسے بدلنے کے لئے سیاست۔ اوّل الذکر انتخابی سیاست ہے اور مؤخر الذکر انقلابی سیاست۔ ملک میں جو نظام قائم ہے اسے اگر آپ درست سمجھتے ہیں تو اسے چلانے کے لئے الیکشن میں حصہ لیجئے' اپنا منشور دیجئے' اپنی پالیسی دیجئے' الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کیجئے' پھر الیکشن میں جن کو بھی عوام ووٹ دے دیں گے وہ نظامِ حکومت چلائیں گے۔ اگر آپ کو عوام نے منتخب نہیں کیا تو اپوزیشن میں بیٹھ کر اپنا رول ادا کرتے رہئے اور منتظر رہئے' ہو سکتا ہے اس سے اگلے الیکشن میں لوگ آپ کو ووٹ دے دیں۔ لیکن یہ جو سیاسی عمل ہے جسے انتخابی عمل کا نام دیا جاتا ہے یہ نظام کو بدلنے کے لئے نہیں ہوتا' بلکہ پہلے سے قائم نظام کو چلانے کے لئے ہوتا ہے۔ امریکہ کے انتخابات میں حصہ لینے والے ڈیموکریٹس ہوں یا ری پبلکن ہوں وہ نظام نہیں بدلنا چاہتے' وہ اسی نظام کو چلانا چاہتے ہیں۔ گویا

امریکہ میں قائم پارلیمانی جمہوری نظام ان کے مابین متفق علیہ ہے۔ اسی طرح برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی ہو یا لیبر پارٹی' ان میں سے برطانیہ کے نظام کو کوئی بھی نہیں بدلنا چاہتا' البتہ اس کو بہتر سے بہتر انداز میں چلانے کے لئے یہ اپنی طرف سے بہتر سے بہتر پالیسیاں پیش کرتے رہتے ہیں۔ تو یہ ہے کسی نظام کو چلانے کی سیاست جو عہد حاضر میں "انتخابی سیاست" کہلاتی ہے۔ اس میں اور "انقلابی سیاست" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انقلابی سیاست پہلے سے موجود نظام کو بدلنے کی سیاست ہے۔ جو شخص موجودہ نظام ہی کو غلط سمجھتا ہے اسے الیکشن میں حصہ لے کر کیا کرنا ہے۔ یہ اس کے وقت کا ضیاع ہے۔ فرض کریں اگر امریکہ میں کمیونسٹ ہوں تو وہ الیکشن میں حصہ لیں گے؟ نہیں' بلکہ وہ تو کچھ اور ہی کام کریں گے' اگر ان کا داؤ چل جائے تو وہ انقلاب کی جدوجہد کریں گے۔ انتخابات میں آکر اپنی منزل کھوٹی نہیں کریں گے۔ اور دنیا میں جیسے انقلاب آتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ جیسے روس کا انقلاب آیا تھا' جیسے فرانس کا انقلاب آیا تھا اور جیسے ایران میں انقلاب آیا تھا وہ کس کو معلوم نہیں؟ خمینی صاحب وہاں قیامت تک انتخابات کے ذریعے برسراقتدار نہیں آسکتے تھے۔ اور وہاں جو بھی تبدیلی جس درجے میں بھی آئی ہے وہ نہ انتخابات کے ذریعے آسکتی تھی اور نہ ہی وعظ و نصیحت اور تلقین و تبلیغ کے ذریعے آسکتی تھی۔ وہاں جو تبدیلی آئی ہے اس سے ہمارا اتفاق ضروری نہیں ہے۔ ہمیں کمیونزم سے اتفاق نہیں ہے' لیکن اس کی بھی مثال تو دے رہے ہیں کہ اس کے عنوان سے ایک انقلاب تو دنیا میں آیا تھا۔ تو ہم نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا ہے وہ اسی انقلابی سیاست کا ہے' انتخابی سیاست کا نہیں ہے۔ اس طرح میں اور میرے ساتھی ۷۵ فیصد سیاست میں ہیں' لیکن ۲۵ فیصد سیاست میں نہیں ہیں اور وہ ہے انتخابی سیاست۔ ہمارے نزدیک یہاں جو جائز سیاست ہے وہ انقلابی سیاست ہے۔ یعنی یہاں کے نظام کو بدلنے کی جدوجہد کی جائے۔ اس کے لئے جماعت بنائی جائے' طاقت فراہم کی جائے' باطل نظام کے ساتھ ٹکرایا جائے اور اس کو بیخ و بُن سے اکھیڑ کر رکھ دیا جائے اور اس کی جگہ اسلام کا نظام قائم کیا جائے۔ اس کو چھوڑ کر انتخابی سیاست میں حصہ لینا ہمارے نزدیک وقت کا ضیاع ہے۔ یہ ملک کے لئے بھی صحیح نہیں اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں دینی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

انقلابی سیاست کا مفہوم

اس سلسلے کی اگلی بحث یہ ہے کہ وہ انقلابی سیاست ہے کیا؟ اسے اختصار کے ساتھ واضح کر دیتا ہوں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر میں نے پوری پوری مفصل تقریریں کی ہیں۔ اس ضمن میں "منہجِ انقلابِ نبوی" کے عنوان سے کتاب بھی موجود ہے جو میرے گیارہ خطباتِ جمعہ پر مشتمل ہے۔ پھر اس کو مزید مختصر کر کے اس سال قرآن آڈیٹوریم میں پانچ خطابات میں بیان کیا ہے' جس کے ویڈیو کیسٹ بھی تیار ہو گئے ہیں۔ یہاں میں اسی بات کو چند جملوں میں بیان کر رہا ہوں اور یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ اس ملک میں اسلام کبھی بھی انتخابی سیاست کے راستے سے نہیں آ سکتا' بلکہ جب بھی آئے گا انقلابی عمل کے ذریعے ہی سے آئے گا۔ انقلابی سیاست یا انقلاب کا عمل یہ ہے کہ سب سے پہلے لوگوں میں ذہنی اور فکری تبدیلی برپا کی جائے۔ جس طرح ہر عمارت کسی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اسی طرح ہر نظام کسی فکر اور کسی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر پہلے سے موجود نظام کو بدلنا ہے تو متبادل فکر اور نظریہ (Alternate Idealogy) پیش کرنا ہو گا اور اسے لوگوں کے ذہنوں میں اتارنا ہو گا۔ یہ متبادل فکر جب ذہنوں میں راسخ ہو جائے گا تو لوگوں کے اعمال اور اخلاق میں بھی انقلاب آ جائے گا۔ سوچ بدلے گی تو عمل بھی لازمی طور پر بدلے گا۔ کسی بھی انقلاب کے لئے یہ دو بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں' یعنی سوچ اور فکر کی تبدیلی' اور عمل اور اخلاق کی تبدیلی۔

البتہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ یہ تبدیلی اکثریت میں نہیں آیا کرتی' ہمیشہ ایک اقلیت میں آتی ہے۔ لیکن وہ اقلیت منظم ہو کر اپنی تنظیم کے بل پر نہایت مؤثر ہو جاتی ہے جیسے آپ کہتے ہیں ایک اکیلا دو گیارہ اور تیسرا لگ گیا تو ایک سو گیارہ' چوتھا لگ گیا تو ایک ہزار ایک سو گیارہ۔ اس اعتبار سے وہ اقلیت منظم ہونے کے بل پر غالب آتی ہے اور نظام کو بدل دیتی ہے۔ ورنہ ایسے لوگ کبھی بھی دنیا میں اکثریت میں نہیں ہوئے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پورے جزیرہ نمائے عرب کی تعداد کے اعتبار سے دیکھیں تو اکثریت مومنینِ صادقین کی نہیں تھی۔ یہاں کسی کو کوئی مغالطہ نہ ہو' میں پورے جزیرہ نمائے عرب کی بات کر رہا ہوں کہ وہاں اکثریت مومنینِ صادقین کی نہیں

تھی' صرف مکے اور مدینے کی بات نہیں کر رہا۔ اگر پورے ملک عرب میں اکثریت مومنین صادقین کی ہوتی تو کیا مسیلمہ کذاب کا ساتھ دینے کے لئے لاکھوں آدمی نکل آتے؟ کیا زکوٰۃ کا انکار کرنے والے لاکھوں آدمی میدان میں آجاتے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مومنِ صادق ہو اور پیچھے ہٹ جائے۔ ع "ایں خیال است و محال است و جنوں"۔ جو مومن صادق ہے اس کے تو چاہے بخئے ادھیڑ دیئے جائیں' اس کے جسم کی دھجیاں اڑا دی جائیں تب بھی وہ پیچھے نہیں ہٹتا۔ معلوم ہوا کہ وہاں پر بھی عرب کی اکثر آبادی کے اعتبار سے اصل حکم وہی تھا جو سورۃ الحجرات میں بایں الفاظ وارد ہوا:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ

"یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ ان سے) کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے ہیں۔ اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔"

تو یہ ایک مثال ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فکر و عمل کی تبدیلی کبھی اکثریت میں نہیں آیا کرتی۔ کیا روس کے انقلاب کے وقت روس کے اندر اکثریت کمیونسٹوں کی ہو گئی تھی؟ یہ تو کبھی بھی نہیں ہوئی' آخری وقت تک نہیں ہوئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تو ہمیشہ چند لاکھ ہی رہتے تھے جبکہ ملک کی آبادی کروڑوں پر مشتمل تھی۔ تو انقلابی عمل میں کبھی اکثریت تبدیل نہیں ہوا کرتی' ہمیشہ اقلیت منظم ہوتی ہے' لیکن یہ اقلیت ہوتے ہوئے اپنی تنظیم اور اپنی قربانی کے بل پر اکثریت پر غالب آجاتی ہے۔ اگر کہیں دس آدمی ہوں لیکن وہ سب کے سب اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوں' اور دوسری طرف صرف دو آدمی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آجائیں تو وہ دس فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے۔ وہ ان دو کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

جسے موت زندگی سے زیادہ خوش آئند ہو جائے اسے خوف کاہے کا؟ اب اسے کیا شے ڈرائے گی؟ ان دو تبدیلیوں کے بعد یہ اقلیت جب معتد بہ تعداد میں منظم ہو جاتی ہے تو

پھر ٹکراؤ مول لیتی ہے اور اس کا اس نظام کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آج کے زمانے میں اس تصادم اور ٹکراؤ کی صورت کیا ہوگی۔ حضورؐ کے زمانے میں تو یہ تلوار کے ساتھ تلوار کا ٹکراؤ تھا' لیکن آج کے زمانے میں معاملہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ مدِمقابل بھی مسلمان ہیں' خواہ نام کے مسلمان ہی ہوں۔ سیکولر ذہن والے بھی مسلمان ہیں' ملحدانہ نظریات رکھنے والے بھی مسلمان ہیں' بھٹو صاحب بھی مسلمان تھے' بے نظیر بھی مسلمان ہے اور نواز شریف بھی مسلمان ہے جس نے نفاذِ شریعت ایکٹ کے اندر سود کو جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔ نواز شریف تو خیر سے نمازی بھی ہے اور ان کا گھرانہ بھی مذہبی گھرانہ ہے۔ دوسرے یہ کہ آج کل کی حکومتوں کے پاس قوت بہت زیادہ ہوتی ہے اور عوام نہتے ہوتے ہیں لہٰذا حکومت کے خلاف کوئی مسلح جدوجہد کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ موجودہ حالات میں اس کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جانا چاہئے اس کی مثال ایرانیوں نے ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ یعنی نہتے عوام سڑکوں پر آ کر حکومتی نظام کو معطل کر دیں' منکرات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں کہ ہم اپنے جیتے جی یہ نہیں ہونے دیں گے' ان پر تشدد کیا جائے تو برداشت کریں' گولیاں چلیں تو اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں اور راہِ حق میں جان دے دیں۔ یقیناً اس سے بڑھ کر نفع کا سودا اور کوئی نہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

آپ دیکھتے ہیں کہ ایرانیوں نے اس طریقے سے بادشاہ کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر کے دکھا دیا۔ انہوں نے نہ تو بغاوت کی' نہ کوئی توڑ پھوڑ کی اور نہ کوئی چھاپہ مار کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا' لیکن ایران کی اڑھائی ہزار سالہ عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے خواب دیکھنے والے "شہنشاہ آریہ مہر" کو ایران سے فرار ہونے پر اس طرح مجبور کر دیا کہ ع "دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں!" یہ بڑی عظیم مثال ہے جو آج کے دور میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ اور اسی طریق کار سے اِس ملک میں اسلام کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اسلام یہاں نہ الیکشن کے راستے سے لایا جا سکتا ہے اور نہ صرف وعظ و نصیحت کے ذریعے سے۔ اگر صرف وعظ و نصیحت سے اسلام آ جاتا تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مسلمان کی جان تو کجا کسی کافر کی جان کا ضیاع بھی گوارا نہ کرتے۔ آپؐ سے بڑا معلّم' آپؐ سے بڑا مبلّغ' آپؐ سے بڑا واعظ' آپؐ سے بڑا مربّی اور آپؐ سے سے بڑا مزکّی بھلا کوئی ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ محض دعوت و نصیحت اور تبلیغ اور تلقین ہی سے نظام بدل جائے گا تو وہ جنت الحمقاء میں بستا ہے اور میرے نزدیک وہ شخص محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر طعن کر رہا ہے کہ انہوں نے اس راستے میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کے خون کا نذرانہ کیوں دلوایا؟ دامنِ احد میں خود آنحضورؐ کا خون زمین میں جذب ہوا ہے اور سینکڑوں صحابہ کرامؓ کی جانیں اس راہ میں قربان ہوئی ہیں۔ آپؐ کے ایک ایک صحابیؓ کی جان آج کے لاکھوں مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ قیمتی ہے یا نہیں؟ ------ اسی طرح بعض تحریکوں نے یہ جو تیسرا راستہ اختیار کر لیا ہے پُر تشدد چھاپہ مار کارروائیوں کا' تو اس راستے سے بھی اسلام نہیں آ سکتا۔ ایسی کارروائیاں باہر سے آئی ہوئی قابض افواج کے خلاف تو کامیاب ہو سکتی ہیں جن کی سپلائی لائن بہت طویل ہو' لیکن قومی فوج کے خلاف کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس وقت الجزائر اور مصر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے نزدیک صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اگرچہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ بڑی ہمدردی ہے اور مصر کی "جماعہ اسلامیہ" کے لوگوں کو تو میں بہت قیمتی سمجھتا ہوں' لیکن انہوں نے جو طریق کار اختیار کر لیا ہے وہ غلط ہے' چاہے وہ حکومتی تشدد کے ردِّعمل میں اختیار کیا گیا ہو۔ ان تینوں راستوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ اسلام لانے کے راستے نہیں ہیں۔ اسلام لانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے انقلابی راستہ۔ اس انقلابی عمل کے لئے دینی اصطلاحات میں بعد میں بتاؤں گا' ابھی تو عمومی انداز میں یہ بتایا ہے کہ انقلاب کسے کہا جاتا ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ کہ (i) ایک انقلابی نظریئے کے تحت' ایک معتدبہ تعداد میں فکری اور نظری تبدیلی' اور اس کے نتیجے میں عملی اور اخلاقی تبدیلی برپا کرنا۔ (ii) پھر ان کو ایک جماعت کی صورت میں منظم کرنا۔ (iii) پھر نظامِ باطل کے ساتھ ٹکراؤ مول لینا۔ بقول اقبال۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

دینی اصطلاح میں پہلی بات یہ ہو گی کہ سب سے پہلے کچھ لوگوں میں شعوری ایمان

پیدا کیا جائے۔ ایمان ایک فکر بھی ہے، فلسفہ بھی ہے، ایک رائے بھی ہے، ایک Metaphysics(مابعد الطبیعیات) بھی ہے، نفسیات بھی ہے، لیکن انقلاب کے لئے مطلوب یہ ہے کہ ایک معتدبہ تعداد میں شعوری ایمان پیدا ہو جائے، اور اس کے نتیجے میں عملی تبدیلی یعنی تقویٰ پیدا ہو جائے۔ یہ مضمون سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۵ میں وارد ہوا اور ان تین آیات کے حوالے سے میری ایک کتاب بھی "امتِ مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحۂ عمل" کے عنوان سے موجود ہے۔ ان تین آیات میں تین نکات بیان ہوئے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝

"اے ایمان (کا دعویٰ کرنے) والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور دیکھنا تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر فرمانبرداری کی حالت میں"۔

یعنی جب اللہ پر ایمان لائے ہو تو اس کے تقویٰ کا حق بھی ادا کرو اور تمہارا کوئی لمحہ بھی اس کی معصیت میں بسر نہیں ہونا چاہئے۔ اب جو لوگ یہ مرحلہ طے کر لیں اور اللہ کے سامنے اپنے اختیار کو اس کے قدموں میں ڈال دیں وہ مل جل کر ایک طاقت بنیں۔ چنانچہ اگلی آیت میں دوسرا نکتہ بیان فرمایا: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا** "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور باہم متفرق نہ ہو" اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ، قرآن کو اپنا امام اور راہنما بناؤ اور مل جل کر ایک قوت بنو، طاقت بنو، حزب اللہ بنو، پھر منتشر نہ ہو۔ یہ ایک جماعت بنانا ہے جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

"(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں: جماعت (کی شکل اختیار کرنے) کا، (پھر اس جماعت میں جو حکم ملے اسے) سننے اور ماننے کا، اور ہجرت کا اور جہاد کا"۔

ان پانچ چیزوں سے انقلاب برپا ہو گا۔ یہی مضمون سورۃ التغابن میں بایں الفاظ آیا ہے:

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُوقَ

شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○

"پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حدِ امکان تک' اور سنو اور اطاعت کرو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کو۔ اور جو کوئی بچا لیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

تو پہلے شعوری ایمان پیدا ہو' پھر اپنی زندگی میں اور اپنے دائرۂ اختیار میں' یعنی اپنے گھر میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ گویا اپنی ذات میں اللہ کے خلیفہ بن جاؤ' اپنے وجود پر اللہ کی حاکمیت نافذ کرو۔ اپنے گھر میں اللہ کے خلیفہ بن جاؤ' اللہ کے احکام اپنے گھر میں نافذ کرو۔ پھر مل جل کر ایک جماعت بنو' طاقت بنو' حزب اللہ بنو۔ پھر اس کے بعد تیسرا نکتہ یہ کہ:

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○

"اور چاہئے کہ تم سے ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے' نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

یعنی تمہاری جو اجتماعیت وجود میں آئے گی اسے تین کام کرنے ہوں گے: (i) دعوت الی الخیر (ii) امر بالمعروف' اور (iii) نہی عن المنکر۔ سب سے پہلا کام' خیر کی دعوت دو' خیر کی طرف بلاؤ۔ اور سب سے بڑا خیر اللہ کا کلام ہے جس کے بارے میں سورۂ یونس میں فرمایا گیا: "ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ" کہ جو دولت تم جمع کرتے ہو' جو روپیہ اور مال و اسباب جمع کرنے کی تم تگ و دو کر رہے ہو ان سب سے بڑھ کر خیر' خیرِ مطلق یہ قرآن ہے۔ تو دعوت الی الخیر کا مطلب دعوت الی القرآن ہے۔ دوسرا کام ہے امر بالمعروف' نیکی کا حکم دو' اور تیسرا نہی عن المنکر' بدی سے روکو۔ پھر ان میں سے تیسری چیز "نہی عن المنکر" کے تین درجے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیئے۔ مسلم شریف کی بہت مشہور حدیث ہے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ

"جو کوئی بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اسے بدلے! اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس برائی کو روکے!) اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو اپنے دل سے!"

یعنی نہی عن المنکر کا پہلا درجہ "بالید" کا ہے --- کہ کوئی برائی نظر آئے تو اپنے زورِ بازو سے اس کو روک دیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس برائی سے نمٹنے کے لئے مؤثر قوت موجود ہو۔ بصورتِ دیگر بندۂ مومن کا فرض ہے وہ اس قوت کے حصول کے لئے کوشاں ہو ------ اور اس کے ساتھ ہی "نہی عن المنکر باللسان" کا فریضہ ادا کرتا رہے۔ یعنی زبان سے لوگوں کو روکا جائے کہ خدا کے لئے اس سے باز آ جاؤ' اس برائی کو چھوڑ دو۔ زبان کے علاوہ قلم اور نشرواشاعت کے دیگر ذرائع بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اور اگر اس کی بھی استطاعت نہیں ہے تو کم از کم دل سے تو اسے برا سمجھے۔ برائی کے خلاف دل میں نفرت تو موجود ہو۔ آخر میں فرمایا کہ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ یعنی اگر یہ بھی نہیں تو ایمان ہی نہیں۔ اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث کا ہم ابھی مطالعہ کریں گے' اس کے آخر میں الفاظ آئے ہیں: "وَلَیسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ" کہ اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں! خواہ اپنے آپ کو مومن اور متقی سمجھتے رہو' لیکن اگر منکر سے نفرت ہی ختم ہو گئی ہے تو ایمان کی یکسر نفی ہو گئی ہے۔ اگر راتوں کی نیند بھی حرام نہیں ہوتی کہ یہ ماحول میں کیا ہو رہا ہے اور میں اس کے خلاف کچھ کر نہیں پا رہا' اگر منکرات کو دیکھ کر چہرے کا رنگ بھی متغیر نہ ہو اور انسان اندر سے تلملا نہ اٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی غیرتِ ایمانی دم توڑ گئی۔ اور حضورؐ فرما رہے ہیں کہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں رہا۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِن ذٰلِکَ!

دوسری حدیث اس سے بھی زیادہ واضح ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ بھی صحیح مسلم کی روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کبارِ صحابہؓ اور فقہاءِ صحابہؓ میں سے ہیں اور فقہ حنفی دراصل فقہ عبداللہ بن مسعودؓ ہے اور حضرت امام ابو حنیفہؒ دو واسطوں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کے شاگرد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا : "مَامِن نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِی اُمَّتِہٖ قبلی" یعنی "کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث فرمایا ہو"۔ "اِلَّا کان لہٗ مِن اُمَّتِہٖ حوارِیّون وَاَصحاب" یعنی "مگر یہ کہ اس کے لئے اس کی امت میں سے کچھ حواری اور اصحاب ضرور ہوتے تھے"۔ گویا ہر نبیؑ کے کچھ نہ کچھ حواری اور اصحاب ضرور ہوتے تھے، کم ہوں یا زیادہ۔ بارہ ہوں، ۷۲ ہوں، سینکڑوں ہوں یا ہزاروں۔ "حواری" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو کہا جاتا ہے اور "صحابہؓ" اور "اصحابؓ" محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو۔ اب آگے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ حواری اور اصحاب کرتے کیا تھے : "یَاْخُذون بِسُنّتِہٖ وَیَقتدُون بِاَمرِہٖ" یعنی "وہ اس (نبیؐ) کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے" ------ "ثم اِنّھا تَخلُفُ مِن بَعدِھم خُلوفٌ" یعنی "پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آجاتے تھے" ---- جیسے ہم ناخلف ہیں۔ اور آج کے مسلمان پوری دنیا میں اسلام کو بدنام کرنے والے اور اس کی حرمت کو بٹہ لگانے والے ہیں، خواہ تعداد میں وہ ۱۳۰ کروڑ ہوں۔ یہ ناخلف لوگ کیا کرتے تھے؟ فرمایا : "یَقُولُون مالَا یَفعلُون وَ یفعلون مَا لا یُؤمَرُون" یعنی "کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے ---- اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا"۔ یعنی قول و فعل کے زبردست تضاد کا شکار ہو جاتے تھے، جیسے اِس وقت ہمارا حال ہے کہ دعوے بہت بلند بانگ لیکن عمل کے اعتبار سے صفر ہیں۔ عشقِ رسولؐ کے دعووں میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں لیکن خود اپنے وجود اور اپنی شکل و صورت میں بھی سنتِ رسولؐ کا التزام نہیں ہے۔ سیرت النبیؐ کے عنوان سے جلوس نکالا جا رہا ہے اور اس میں بھنگڑا ڈالا جا رہا ہے۔ ہم وہ کچھ کر رہے ہیں جس سے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ پھر "یَفعلُونَ مالا یُؤمَرُون" سے وہ بدعات اور نئی نئی رسومات بھی مراد ہیں جو بعد کے ادوار میں ایجاد کرلی جاتی رہی ہیں، جن کا نہ اللہ کی کتاب میں کوئی حکم ہے، نہ اس کے رسول ﷺ کی سنت اور صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل میں ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

جب یہ صورت پیدا ہوجائے تو اب مومنین صادقین کو کیا کرنا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا : "فَمَن جَاھَدَھُم بِیدِہٖ فھو مُؤمِنٌ" یعنی "تو جو کوئی ان سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مومن ہے"۔ اور "وَمَن جَاھَدَھُم بِلِسانِہٖ فھو مُؤمِنٌ" یعنی "اور جو کوئی ان سے اپنی زبان

سے جہاد کرے گا تو وہ مومن ہے"۔ "وَمَنْ جَاهَدَهُم بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ" یعنی "اور جو کوئی ان (ناخلف لوگوں) سے اپنے دل سے جہاد کرے گا تو وہ مومن ہے"۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ" یعنی "اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے"۔

تو یہ ہے قرآن حکیم اور احادیثِ نبویؐ کے حوالے سے اس انقلابی عمل کی تعبیر کہ جب تک وہ جماعت اتنی تعداد میں نہیں ہے کہ وہ چیلنج کر سکے اور میدان میں آ کر مقابلہ کرے اس وقت تک وہ نہی عن المنکر باللسان کرتی رہے گی کہ خدا کے لئے باز آجاؤ، ان حرام کاموں کو چھوڑ دو، بے حیائی کو ختم کرو، اخبارات کے صفحات کو عورتوں کی رنگین تصاویر سے مزیّن نہ کرو، سودی لین دین حرام ہے، یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، اس سے باز آجاؤ! اس کے لئے ہاتھ جوڑیں گے، خوشامدیں کریں گے، پھر مظاہرے کریں گے، پلے کارڈ لے کر سڑکوں پر نکلیں گے، ذرائع ابلاغ میں سے جو بھی ہم استعمال کر سکیں گے کریں گے، جو کچھ کہہ سکتے ہیں کہیں گے، جو کچھ چھاپ سکتے ہیں چھاپیں گے، آڈیو اور ویڈیو کا استعمال کریں گے۔ یہ سب نہی عن المنکر باللسان کے درجے میں ہیں ـــــ اور جب کافی طاقت فراہم ہو جائے گی تو پھر میدان میں آئیں گے کہ ہم یہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ پھر ہم منکرات کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہوں گے، باطل نظام کو چیلنج کریں گے اور اسے چلنے نہیں دیں گے، سسٹم کو بلاک کریں گے، یہاں تک کہ ترکِ موالات کریں گے، ٹیکس نہیں دیں گے کیونکہ یہ نظام درست نہیں ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اس کے بعد پھر بھٹی دہک اٹھے گی۔ جب آپ کہیں گے کہ ہم اس باطل نظام کو چلنے نہیں دیں گے تو اس نظام کے ساتھ جن کے مفادات وابستہ ہیں، جنہیں اس میں مراعات حاصل ہیں، جن کی چودھراہٹیں، سیادتیں اور قیادتیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں وہ اس کا دفاع کریں گے ؏ "نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے!" پھر ٹکراؤ ہوگا ـــــ یہ ٹکراؤ جیسا کہ میں نے عرض کیا، حضورؐ کے زمانے میں تو تلوار کا تلوار سے اور انسانوں کا انسانوں سے ہوا، لیکن موجودہ دور میں اس ٹکراؤ کی جو صورت ہوگی وہ "یکطرفہ جنگ" کی ہوگی۔ یعنی جب آپ سڑک پر نکل کر سسٹم کو بلاک کریں گے تو

آپ کو تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا' آپ کو یہ تشدد برداشت کرنا ہوگا' لیکن مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر گولیاں چلتی ہیں تو انہیں سینے پر سہنا ہوگا اور اس راستے میں جان کا نذرانہ دینا ہوگا۔ اسلامی انقلاب کا طریق کار یہی ہے' اس کے سوا کسی دوسرے راستے سے اسلام نہیں آسکتا۔ تو یہ ہے پاکستان کے حالات کے اعتبار سے ہمارا موقف۔

درمیانی عرصے میں کرنے کا کام

اب آیئے چوتھی بات کی طرف۔ جب تک اس ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوتا اور یہ بالفعل ایک اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار نہیں کرتا اس درمیانی عرصے میں کرنے کا کام کیا ہے؟ دعوت کا یہ کام تو ہم اپنی بساط بھر کر رہے ہیں' یعنی دعوتِ دین' توبہ اور تجدیدِ ایمان کی دعوت' اصلاحِ اعمال کی دعوت' تنظیم میں شمولیت کی دعوت' اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو لوگوں میں متعارف کروانے کے لئے تحریکِ خلافت کی معاونت کی دعوت ـــــ لیکن اس عرصے کے دوران کیا ملکی سیاست کے بارے میں ہم صرفِ نظر کرلیں یا اس حوالے سے بھی ہماری کوئی ذمہ داری بنتی ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ یہ چونکہ بہرصورت ایک مسلمان معاشرہ ہے' گو اسلامی ریاست نہیں مگر مسلمان ملک تو ہے' یہاں کے بسنے والے ۹۵ فی صد سے زائد نام کے مسلمان تو ہیں' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا تو ہیں' کلمہ گو تو ہیں' لہٰذا اس کی وقتی سیاست کے حوالے سے بھی ہم پر ایک دینی فریضہ عائد ہوتا ہے۔

میں یہ بات آج خاص طور سے بہت وضاحت سے کہہ رہا ہوں کیونکہ بہت سے حضرات مجھے بہت ہی خیر خواہی سے مشورہ دیا کرتے ہیں کہ آپ خواہ مخواہ سیاسی تبصرے کرتے ہیں' تجزیئے کرتے ہیں اور اس ضمن میں مشورے دیتے رہتے ہیں' جبکہ اس کا فائدہ تو کچھ ہوتا نہیں۔ نہ بے نظیر آپ کی سنتی ہے' نہ نواز شریف' اور نہ ہی صدر اسحاق سنتے ہیں۔ اور تو اور ضیاء الحق صاحب نے نہیں سنی' تو اس سے فائدہ کیا؟ آپ کیوں خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ جو بات آپ کرتے ہیں وہ کسی کے حق میں چلی جاتی ہے اور کسی کے خلاف چلی جاتی ہے۔ تو آپ کی بات جس کے خلاف چلی گئی وہ آپ

سے ناراض ہو جاتا ہے اور جس کے حق میں چلی گئی اس کا جو مخالف ہے وہ آپ سے ناراض ہوتا ہے' تو اس سے فائدہ کیا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ یہ بات بظاہر بڑی وزنی نظر آتی ہے اور اس کو خلوص کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارے چاہنے والے' ہمارے کام سے دلچسپی رکھنے والے' ہمارے خیرخواہ یہ مشورہ دیتے رہے ہیں۔ آج میں اس کا جواب دے رہا ہوں۔ وہ یہ کہ میں یہ کام اپنا دینی فریضہ سمجھ کر کرتا ہوں۔ گویا میں اگر ملکی معاملات پر اظہار رائے کرتا ہوں تو اپنا دینی فریضہ سمجھ کر۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دینی فریضہ تو کتاب و سنت کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میں اس کی دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کر رہا ہوں۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" یعنی دین تو نام ہی نصیحت کا ہے۔ نصیحت کا ترجمہ خیرخواہی بھی ہے' خلوص بھی ہے' وفاداری بھی ہے اور کسی کی خیرخواہی میں کوئی بات کہنا بھی ہے۔ آپ اپنے چھوٹے کو نصیحت کرتے ہیں کہ دیکھو بھائی یہ جو تم کر رہے ہو صحیح نہیں ہے۔ دیکھو سگریٹ چھوڑ دو' اس سے پیسے بھی ضائع ہوتے ہیں اور پھیپھڑے بھی جلا رہے ہو۔ یہ سب چیزیں نصیحت ہیں۔ تو نصیحت کا معنیٰ اصل تو خیرخواہی اور وفاداری ہے' لیکن اسی خیرخواہی کے جذبے کے تحت آپ کسی کو مشورہ دیتے ہیں تو وہ بھی نصیحت ہے۔ اور اردو میں تو نصیحت کا لفظ صرف اسی معنی میں مستعمل ہے۔ تو حدیث کے الفاظ ہیں: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" یعنی "دین تو نام ہی نصیحت کا ہے"۔ "قِیْلَ لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" یعنی "پوچھا گیا' اے اللہ کے رسولؐ کس کے لئے نصیحت؟" آپؐ نے جواباً ارشاد فرمایا: "لِلّٰہِ وَلِکِتٰبِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ" یعنی "اللہ کے ساتھ' اس کی کتاب کے ساتھ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ وفاداری اور مسلمانوں کے قائدین اور ان کے عوام کے ساتھ نصح و خیرخواہی"۔

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ" یعنی "مجھے (اللہ کی طرف سے) بڑے جامع کلمات عطا کئے گئے ہیں"۔ آپؐ کا اپنا دعویٰ ہے: "اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ" یعنی "میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں"۔ عرب کی فصاحت اور بلاغت آپؐ پر ختم ہے۔ آپؐ کے کلام سے بالاتر تو پھر صرف اللہ کا کلام ہے' کوئی اور انسانی کلام حضورؐ کے کلام سے بالاتر نہیں ہے۔ اس مرتبہ میں نے

اس حدیث کو اپنا موضوع بنا کر اس کے الفاظ پر غور کیا تو مجھ پر اس کی عظمت کا عجیب انکشاف ہوا۔ فرمایا گیا کہ تمہاری اولین وفاداری تو اللہ کی ذات کے ساتھ ہے' اس میں کوئی شک ہی نہیں۔ دوسری وفاداری اللہ کی کتاب کے ساتھ ہے۔ اور بڑی عجیب بات ہے کہ یہاں کتاب کو رسولؐ پر مقدم کیا گیا۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ کتابُ اللہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا کلام ہمارے لئے ابدالآباد تک اللہ کے قائم مقام ہے۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ وفاداری' چوتھے نمبر پر مسلمانوں کے قائدین اور اماموں کے ساتھ وفاداری اور نصیحت۔ یہاں بھی عجیب نکتہ ہے کہ "اَئِمۃ المؤمنین" کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ "اَئِمۃُ المُسلمین" کے ہیں۔ تم مسلمانوں کے اماموں' لیڈروں' اور قائدوں کے روبرو سچی بات کہتے رہو۔ کسی کو اچھی لگے یا بری لگے اس کی کوئی فکر نہ کرو۔ جو تمہارے نزدیک صحیح بات ہے خیر خواہی کے جذبے کے تحت ضرور کہا کرو۔ اور آخر میں فرمایا: "وَعامَّتِھم" یعنی "اور مسلمان عوام کے ساتھ نصح و خیر خواہی" ------ یہاں بھی نوٹ کیجئے کہ مسلمان عوام کو بعد میں لائے ہیں اور مسلمانوں کے قائدین کو پہلے۔ اس لئے کہ جو شخص بھی قائد ہے' وہ خواہ آپ کو پسند ہے یا نہیں ہے وہ مسلمانوں کا امام اور سربراہ تو ہے۔ اس کی چھوٹی سی غلطی لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور اس کا چھوٹا سا صحیح عمل لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ائمۃ المسلمین کو عامۃ المسلمین سے مقدم کیا۔ گویا مسلمانوں کے ائمہ' قائدین' سربراہ' وہ لوگ کہ جن کی طرف مسلمان رہنمائی کے لئے دیکھتے ہیں یا جن کے ہاتھوں میں بالفعل ان کی زمام کار ہے انہیں خلوص' اخلاص اور وفاداری کے ساتھ مشورہ دینا اور عام مسلمانوں کو بھی صحیح مشورے دینا لازمی ہے۔

تو یہ پانچ "نصیحتیں" جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہیں میرے ایمان کا تقاضا ہیں اور مجھ پر فرض کے درجے میں عائد ہیں۔ اب کیا میں ایک دینی فریضے سے محض اس وجہ سے رک جاؤں کہ یہ بات فلاں کو اچھی نہیں لگے گی' فلاں کو خواہ مخواہ مخالفت پر ابھار دے گی؟ یہی تو نہی عن المنکر باللسان کا فریضہ ہے جو میں ادا کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جبکہ میری عمر کا ۶۲ واں برس ہے' میں آخرت کی منزل سے قریب تر ہوں اور دنیا سے اپنی بساط لپیٹ رہا ہوں' میں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ آج تک

میں نے کبھی یہ نہیں سوچا میری بات کس کو اچھی لگے گی اور کس کو بری لگے گی۔ میں نے ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ میرے نزدیک حق کیا ہے' میں اللہ کی عدالت میں اپنی بات کو Justify کر سکوں گا یا نہیں؟ اور میں اپنے ضمیر کو اس کے اوپر مطمئن پاتا ہوں یا نہیں؟ اس کے سوا مجھے کسی کی پروا نہیں۔ کسی کو اچھا لگے کسی کو برا لگے۔ چاہے وہ ضیاء الحق کا دَور تھا' چاہے ایوب خان کا دور تھا اور چاہے وہ بھٹو صاحب کا دور تھا' جو بات صحیح سمجھی ہے کہی ہے' چاہے وہ عوام کو بری لگے یا اچھی لگے' چاہے کسی قائد کو اچھی لگے یا بری لگے۔ اب جب بھی کوئی سیاسی مشورہ دیتا ہوں وہ لامحالہ وقتی طور پر کسی کے حق میں جاتا ہے اور کسی کے خلاف' تو اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب کو معلوم ہے کہ میری کسی سے دوستی نہیں' کسی سے دشمنی نہیں' میں کسی کا حلیف نہیں' کسی کا حریف یا مخالف نہیں۔ ہماری دوستی صرف پاکستان اور اسلام کے ساتھ ہے۔ اور میں بیان کر چکا ہوں کہ ہم ان دونوں کو ایک وحدت سمجھتے ہیں' کیونکہ پاکستان کی وجہِ جواز بھی صرف اسلام ہے اور اس کی بقاء اور استحکام کا انحصار بھی صرف اسلام پر ہے۔ اس حوالے سے جان لیجئے کہ میرے نزدیک اس انقلابی جدوجہد کے ساتھ ساتھ' ملک اور قوم کے مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے' جسے میں نے نظری سیاست کہا ہے' اپنی آراء پیش کرنا میرا دینی فریضہ ہے اور میں نے ہمیشہ وہی کچھ کہا ہے جسے اس ملک کے حق میں بہتر سمجھا ہے۔ اس کو میں کرتا آیا ہوں اور کرتا رہوں گا' بغیر یہ سوچتے ہوئے کہ میری بات کس کو پسند آتی ہے اور کس کو پسند نہیں آتی۔

پاکستانی سیاست کے بارے میں مستقل موقف

اب اس ضمن میں مَیں کچھ مشورے پیش کر رہا ہوں۔ ان میں کچھ میرے مستقل مشورے ہیں اور میرے سننے والے اور پڑھنے والے گواہی دیں گے کہ جب سے وہ مجھ سے واقف ہیں وہ یہ مشورے سن رہے ہیں۔

میرا پہلا مستقل مشورہ اس ملک کے اعتبار سے یہ ہے کہ یہاں مارشل لاء کبھی نہیں آنا چاہئے۔ اس لئے نہیں کہ مارشل لاء حرام ہے۔ میرے نزدیک سارے مروّجہ نظام ایک جیسے حرام ہیں۔ مغربی جمہوریت سب سے بڑی حرام شے ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ

پھر مارشل لاء سے کون سی قیامت آ جائے گی؟ یہ دراصل حلال و حرام کا مسئلہ نہیں ہے' بلکہ یہ مسئلہ ملکی حالات کے حوالے سے ہے۔ اسلام کی رُو سے تو مغربی جمہوریت کفر ہے اور اِس دَور کا سب سے بڑا شرک ہے' کیونکہ وہ حاکمیتِ عوام کے تصور پر مبنی ہے۔ ہم تو خلافتِ عوام کے قائل ہیں' حاکمیتِ عوام کو شرک سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم مارشل لاء کے اس لئے مخالف ہیں کہ مارشل لاء اس ملک کے لئے زہرِ قاتل ہے اور اُس کا ایک خاص سبب ہے۔ ترکی جیسے ملک کے لئے یہ سمِ قاتل نہیں ہے' لیکن ہمارے لئے ہے۔ اس لئے کہ ہمارا یہ ملک اسلام کے نام پر' لیکن الیکشن کے ذریعے وجود میں آیا تھا۔ تو اس کی پیدائش (Genesis) میں دو چیزیں شامل ہوئیں۔ ایک تو اسلام کا نعرہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ اِلّا اللہ" اور دوسرے ووٹ کا ذریعہ۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی فیصلہ کن کامیابی ہی سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا!

پھر اس مسئلے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہماری فوج ایک خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی صوبہ سرحد کے وسطی اَضلاع (مردان' کوہاٹ اور پشاور) اور پنجاب کے شمالی علاقوں سے۔ ہماری فوج میں نہ سندھ سے کوئی نفری شامل ہے نہ بلوچستان سے۔ لہٰذا جب بھی فوج کی حکومت قائم ہوتی ہے تو وہ ایک علاقے کی حکومت سمجھی جاتی ہے۔ اس سے دوسرے علاقوں میں ایک احساسِ محرومی پیدا ہوجاتا ہے کہ ایک خاص علاقہ ہم پر حکومت کر رہا ہے۔ اسی احساسِ محرومی نے ایوب خان کے زمانے میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لئے فضا ہموار کی۔ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں کے جذبات یہ تھے کہ ہم پنجابی کے غلام بننے کے لئے تو پاکستان میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ یحییٰ خان کے مارشل لاء کو وہ "پنجابی فوج کی حکومت" کا نام دیتے تھے۔ بیچارے مولوی فرید احمد مرحوم کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے' وہ سچے مسلمان اور پکے پاکستانی تھے۔ وہ جب ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترے تو ان کے خلاف یہ نعرے لگائے گئے: "پنجابار دلال پھری جاؤ" (اے پنجاب کے دلال واپس چلے جاؤ) تمہیں یہاں ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترنے کا کوئی حق حاصل نہیں! اس لئے کہ ان کے نزدیک مارشل لاء کا مطلب پنجابی کی حکومت تھا۔ یہی مسئلہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔

مارشل لاء کے بارے میں میرا یہ موقف اتنا مستقل ہے کہ جب ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء کو

ضیاء الحق مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے اُسی وقت یہ کہا تھا کہ مارشل لاء اِس ملک کے لئے خودکشی کے مترادف (SUICIDAL) ہے۔ پھر ۱۹۸۲ء میں میں نے ضیاء الحق صاحب کی شوریٰ میں اعلانیہ طور پر کہا کہ اگر آپ نے یہاں انتخابی عمل کو روکے رکھا تو آپ الذوالفقار کی تشدد پرست سرگرمیوں کو جواز عطا کردیں گے۔ ہم پی ایل او کو اپنی تشدد پسندانہ سرگرمیوں میں اسی لئے حق بجانب قرار دیتے ہیں کہ ان کے لئے کوئی اور راستہ کھلا نہیں رہا تھا۔ یہی معاملہ آج ہے کہ آپ نے الیکشن کا راستہ روک کر لوگوں کے لئے اظہارِ رائے اور اپنے حقوق کے حصول کا ذریعہ بند کردیا ہے' جس کا ردِعمل ہو کر رہے گا۔ پھر دسمبر ۱۹۸۲ء میں تو میں نے انہیں وہ خط بھی لکھ دیا تھا' جو جنگ میں بھی چھپا تھا' کہ اگر آپ نے مارشل لاء کا یہ تسلسل برقرار رکھا تو مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل کا مؤرخ کہیں یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں وقت کی جو عظیم ترین مسلمان مملکت قائم ہوئی تھی اسے پہلے تو ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے (یحییٰ خان اینڈ کمپنی) نے اور پھر اس کے مزید حصے بخرے ایک ایسے شخص کے ہاتھوں ہوئے جو نمازی اور پرہیز گار آدمی تھا۔ بہرحال مارشل لاء کے بارے میں میرا یہ موقف آج نہیں بنا بلکہ مستقل اور دائم ہے اور ۱۹۸۰ء سے لیکر ۱۹۹۳ء تک کم سے کم ۱۳برس کا تسلسل تو میں ریکارڈ کے ساتھ ثابت کرسکتا ہوں۔

اس ضمن میں میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ جب تک یہاں اسلامی انقلاب نہیں آتا' اسلامی ریاست قائم نہیں ہوتی' یہاں عہدِ حاضر کے معروف اور مسلّمہ معیارات پر سیاسی عمل یعنی انتخابی عمل کو جاری رہنا چاہئے۔ غیرمشروط' منصفانہ اور غیرجانبدارانہ انتخابات کا تسلسل ملکی سالمیت کے لئے ناگزیر ہے۔ میری اس بات پر عام طور پر ایک اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ الیکشن کے ذریعے اسلام نہیں آسکتا' دوسری طرف آپ کا موقف یہ ہے کہ الیکشن ہوتے رہنے چاہئیں تو ان باتوں میں تضاد ہے۔ اس کا جواب میں ایک سادہ سی مثال سے دیا کرتا ہوں کہ ایک ہے کسی شخص کا مسلمان ہونا' ایک ہے اس کا زندہ رہنا۔ ان دونوں کے تقاضے جدا ہیں یا نہیں؟ زندہ رہنے کے لئے ہر انسان کو' خواہ وہ مسلمان ہو' ہندو ہو' سکھ ہو' پارسی ہو' عیسائی ہو' تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے' یعنی ہوا' پانی اور غذا۔ ان میں سے آپ ایک شے بھی روک دیں گے تو وہ مر

جائے گا۔ ہوا رک گئی تو چند منٹوں میں ختم' پانی رک گیا تو چند دنوں میں ختم اور غذا رک گئی تو شاید چند ہفتے گزار لے' لیکن آخرکار مرجائے گا' چاہے وہ مومن ہو چاہے کافر۔ تو یہ زندہ رہنے کے تقاضے ہیں' جبکہ مسلمان ہونے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اس کے لئے ایمان چاہئے۔ دل میں کسی قدر یقین والا ایمان ہوگا تبھی تو وہ مسلمان بنے گا۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے تقاضے کچھ اور ہیں (یعنی منہج انقلابِ نبوی پر مبنی انقلابی جدوجہد) اور پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اگر یہاں پر آپ نے انتخابی عمل کو روکے رکھا یا مشکوک بنا دیا جسے عوام کا اعتماد حاصل نہ ہوا تو یہ اس ملک کے لئے خودکشی کے مترادف ہے۔ اس کے نتیجے میں' خاکم بدہن' اس کے ٹکڑے ہوجائیں گے' حصے بخرے ہوجائیں گے۔ چنانچہ یہ عمل نہ صرف جاری رہنا چاہئے بلکہ اس انداز سے جاری رہنا چاہئے جیسے انگریزی کا مقولہ ہے:

"Justice should not only be done, it should also appear to have been done"

میرا تیسرا مشورہ اگرچہ ذرا ضمنی قسم کا ہے لیکن بہت اہم ہے۔ اور یہ بات شاید بعض لوگوں کو کڑوی بھی لگے۔ وہ یہ ہے کہ انتخابی میدان میں یا تو مذہب کا نعرہ کوئی نہ لگائے' اس لئے کہ اس طرح مذہب ایک الیکشن ایشو اور پارٹی ایشو بن جائے گا اور یہ بہت خوفناک بات ہے۔ اس طرح آپ کے سیاسی مخالف مقابلے میں آکر لامحالہ مذہب کے خلاف بولنے پر مجبور ہو جائیں گے اور اگر مذہب کا نعرہ لگانا ہی ہے تو اس کی شرطِ لازم یہ ہے کہ تمام مذہبی سیاسی جماعتیں متحد ہو کر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آجائیں۔ اس طرح چونکہ ووٹ تقسیم نہیں ہوں گے' لہٰذا کامیابی کے کسی حد تک روشن امکانات ہوں گے۔ اگر آپ کو مذہب کی بنیاد پر ہی قوم کی سیاسی صف بندی کروانی ہے تو یہ مذہب چار جگہوں پر تقسیم تو نہ ہو کہ یہ مولانا نورانی میاں کا مذہب ہے' یہ مولانا فضل الرحمٰن کا مذہب ہے' یہ قاضی حسین احمد کا مذہب ہے' اور یہ اہل حدیثوں کا مذہب ہے۔ اس صورت میں تو تباہی ہی تباہی اور بربادی ہی بربادی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی سیاسی جماعتوں کا اس طرح کا اتحاد محال ہے' جو نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہوتا ہے کہ ہر مذہبی جماعت کسی سیکولر جماعت کے

ساتھ تو جڑ جاتی ہے لیکن دو مذہبی جماعتیں آپس میں نہیں جڑتیں۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہوئی ہے جو جمعیت علماء پاکستان (نورانی گروپ) اور جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) ابھی تک آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا اصل ٹیسٹ بھی الیکشن میں ہوگا۔ اگر انتخابات میں بھی یہ اتحاد برقرار رہا تب واقعی اسے اتحاد کہا جائے گا۔ اتحادی جماعتوں کا اصل جھگڑا ہی انتخابات میں ہوتا ہے اور یہ جھگڑا بسا اوقات صرف ایک سیٹ پر ہو جاتا ہے۔ اس وقت تو واقعی صورت حال یہ ہے کہ اتنے فرنٹ اور محاذ وجود میں آچکے ہیں جتنی سیاسی جماعتیں ہیں' لہٰذا اس کا نتیجہ وہی "ڈھاک کے تین پات" کی صورت میں نکلے گا جو پہلے نکلتا رہا ہے کہ مذہب کے حامیوں کے ووٹ تقسیم ہو جائیں گے اور سیکولر قوتوں کو فتح حاصل ہو جائے گی۔ گویا "راج کرے گا خالصہ....."

ان تین مشوروں کی روشنی میں اب ہمیں بحالاتِ موجودہ کیا کرنا ہوگا! سب سے پہلی بات جو میں ۱۹۹۰ء کے الیکشن کے بعد سے کہہ رہا ہوں یہ ہے کہ اس الیکشن کا مینڈیٹ مشکوک تھا' لہٰذا ایک غیر جانبدارانہ نگران حکومت کے زیر انتظام نئے سرے سے الیکشن کرائے جائیں۔ مجھے بے نظیر کی قومی حکومت کی تجویز سے شدید اختلاف ہے' اس لئے کہ قومی حکومت کا چلانا بہت مشکل شے ہے۔ ہم تو یہاں ایک پارٹی کی حکومت نہیں چلا سکتے' قومی حکومت چلانا تو اس سے دس گنا زیادہ مشکل کام ہے۔ پھر یہ کہ اس قومی حکومت میں چونکہ سب پارٹیاں شریک ہوں گی لہٰذا ان کے لوگ اپنی اپنی پارٹیوں کے لئے کام کریں گے۔ میرے نزدیک غیر جانبدار حکومت یا تو ایسے ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل ہو جن کی کوئی سیاسی وابستگیاں نہ ہوں' یا ایسے ریٹائرڈ فوجی جرنیلوں پر مشتمل ہو جو سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہوں اور فوج کی نگرانی میں انتخابات ہوں۔ اس ایک مسئلہ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وقتی طور پر بے نظیر کے ساتھ میرا اتفاقِ رائے ہے یعنی فوج کے ذریعے سے انتخابات کرائے جائیں۔ آخر ہمارے ملک کے اندر کوئی ارضی یا سماوی آفت آجاتی ہے تو فوج کو بلاتے ہیں یا نہیں؟ کہیں کوئی سیلاب آجائے یا زلزلہ آجائے تو امدادی کارروائیوں کے لئے فوج کو طلب کیا جاتا ہے یا نہیں؟ چند برس قبل بشام اور کوہستان میں زلزلہ آیا تھا تو فوج ہی گئی تھی۔ پچھلے سال پنجاب میں سیلاب آیا تو فوج ہی آئی تھی۔ سندھ میں ڈاکوؤں کا مسئلہ تھا تو اس سے بھی تاحال فوج ہی نمٹ رہی ہے۔ انتخابات کا

مسئلہ تو ان سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ اس ملک میں سیاسی عمل جو کہ پٹڑی سے اترا ہوا ہے اس کو صحیح لائن پر چڑھایا جائے۔ تو میرے نزدیک انتخابات کے لئے فوج کی خدمات حاصل کرنا لازم ہے' اسی سے اعتماد قائم ہوگا اور الیکشن منصفانہ ہوں گے۔

اب یہ بھی جان لیجئے کہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات کا مینڈیٹ میرے نزدیک کن بنیادوں پر مشکوک ہے؟ ایک یہ کہ وہی غلام اسحاق خان جس کے اس وقت خاکے اُڑ رہے ہیں' کارٹون بن رہے ہیں' جس کو تھوک کے حساب سے گالیاں دی جا رہی ہیں اسی نے اُس وقت بھی ایسا ہی کھیل کھیلا تھا جو اُس وقت کچھ لوگوں کے حق میں پڑ گیا تو اسے بہت ہی نیک' مدبّر اور سینئر سیاستدان کہا گیا اور آج اس کا کھیل کسی کے خلاف چلا گیا تو گویا ہر برائی اس کے سر آگئی۔ آدمی تو وہی ہے یا نہیں؟ کیا اس کی سرشت بدل گئی کہ پہلے فرشتہ تھا' اب شیطان ہوگیا۔ وہی آدمی ہے' یہی کھیل اس نے اُس وقت کھیلا تھا۔ ایک مخالف پارٹی کے جو بدترین دشمن ہوسکتے تھے ان سب کو نگران حکومتوں میں بٹھادیا تو ایسی نگران حکومتوں کے تحت ہونے والے الیکشن پر کوئی اعتماد ہوسکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ اب یہ راز طشت ازبام ہوچکا ہے کہ آئی جے آئی' آئی ایس آئی نے بنوائی تھی۔ ملک کے سب سے زیادہ حساس ادارے کے سب سے بڑے حساس شعبے نے سیاست میں عمل دخل دیا اور الیکشن کے لئے آئی جے آئی بنوائی۔ تو کیا اب بھی آپ کہیں گے کہ الیکشن کا مینڈیٹ صحیح تھا؟ تیسرے یہ کہ "شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا" کے مصداق خود اُس وقت کے نگران وزیراعظم کا کہنا ہے کہ دھاندلی ہوئی ہے۔ اور آخری بات کہہ رہا ہوں کہ یہ مینڈیٹ جیسا کچھ بھی تھا وہ کسی پارٹی یا کسی شخص کو نہیں ملا تھا' بلکہ وہ آئی جے آئی کو ملا تھا اور اسلام کے نام پر ملا تھا۔ نہ یہ نواز شریف کو ملا تھا اور نہ مسلم لیگ کو۔ وہ مشکوک مینڈیٹ بھی اب ختم ہوچکا' کیونکہ آئی جے آئی سے "جے آئی" (جماعت اسلامی) بھی نکل چکی ہے اور "جے یو آئی" (جمعیت علماء اسلام) بھی۔ اب اس میں رہ کیا گیا؟

جماعت اسلامی بحیثیت مجموعی' اور جے یو آئی' اہل حدیث اور جے یو پی کے دھڑے جمع ہوگئے تو آئی جے آئی بنی تھی جس نے مذہب کے نام پر الیکشن لڑا۔ الیکشن جیت کر نواز شریف نے مذہب سے غداری کی۔ اس نے نفاذِ شریعت ایکٹ وہ پاس کروایا جس میں سود کو برملا جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ اسی لئے میاں طفیل محمد صاحب نے برسرِعام اپنی جماعت

کی قیادت کو ڈانٹا تھا کہ "تمہاری مت ماری گئی تھی کہ تم نے اس نام نہاد نفاذِ شریعت ایکٹ پر دستخط کر دیئے؟"۔ تو اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت میں یہ تماشا بھی ہوا کہ سود کو جاری رکھنے کے لئے ایک قانون بنایا گیا اور اس کا نام "نفاذِ شریعت ایکٹ" رکھا گیا۔ پھر آئی جے آئی سے جماعت اسلامی بھی علیحدہ ہو گئی اور جے یو آئی بھی علیحدہ ہو گئی تو آئی جے آئی بھی ختم ہوئی۔ گویا اول تو واقعہ یہ ہے کہ وہ مینڈیٹ تھا ہی داغدار' مشکوک' اور ناقابلِ اعتماد' پھر جتنا تھوڑا سا تھا وہ بھی ان اسباب کی بناء پر ختم ہو چکا جو میں نے ابھی گنوائے ہیں۔ لہٰذا موجودہ حکومت کے قائم رہنے کا کوئی جواز ہے ہی نہیں۔

میں اس سے کوئی بحث نہیں کر رہا کہ صدر نے جو اسمبلی توڑی تو صحیح توڑی یا غلط' نہ میں عدالتِ عظمیٰ کے فیصلہ پر کوئی تبصرہ کر رہا ہوں' نہ اس پر اظہارِ رائے کر رہا ہوں کہ اسے اس کا حق حاصل تھا یا نہیں۔ میرے نزدیک تو جڑ بنیاد ہی سے یہ حکومت کوئی حقیقی جواز نہیں رکھتی۔ چنانچہ بہترین صورت یہ ہے کہ جلد از جلد اِس ملک کے اندر عام انتخابات کروائے جائیں۔ ہمارا سیاسی بحران روز بروز گہرے سے گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ دنیا میں پاکستان کا مذاق اڑ رہا ہے۔ جو کچھ آج ہو رہا ہے ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ ویسے تو ہماری سیاسی تاریخ کا اس سے بھی بدتر باب ملک غلام محمد جیسے بیوروکریٹ کا دور تھا' لیکن اس کی باتیں اکثر و بیشتر لوگوں کے علم میں نہیں آئی تھیں اور ویسے بھی اُس وقت تک عالمی پریس اور ذرائع ابلاغ میں پاکستان کا ابھی اتنا چرچا نہیں تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ڈھکا چھپا کچھ لوگوں کو معلوم تھا۔ یہ تو اب "شہاب نامہ" میں پڑھئے کہ اُس وقت کون شخص کس طور سے حکومت کر رہا تھا۔ ایک مفلوج شخص جس کی رال ٹپکتی رہتی تھی اور بات کر نہیں سکتا تھا وہ یہاں کے گورنر جنرل کی حیثیت سے مختارِ مطلق بن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی طرح کا مسئلہ آج ہے' دنیا کے اندر پاکستان کی بہت رسوائی ہو رہی ہے۔ آپ کی ایڈمنسٹریشن کا بیڑا غرق ہو چکا ہے۔ اب اس کو اسی طریقے سے طول دینا ملک کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہے' بلکہ سخت نقصان دہ ہے۔ چنانچہ یہاں عام انتخابات جلد از جلد ہونے چاہئیں۔ اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی دن میں ہونے چاہئیں۔ لیکن قومی حکومت کا میں قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک نگران حکومت سیاسی ہونی ہی نہیں چاہئے۔ انتخابات ایسی نگران حکومتوں کے تحت ہوں جن کی کوئی سیاسی

وابستگی نہ ہو اور یہ فوج کی نگرانی میں ہوں۔

یہ میرے نزدیک صحیح بات ہے جو میں اس ملک کی بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اور یہ ملک مجھے اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے بہت عزیز ہے اور بہت پیارا ہے۔ اس حوالے سے نعیم صدیقی صاحب کا وہ شعر میں نے بارہا سنایا ہے۔

اے آندھیو سنبھل کے چلو اِس دیار میں
اُمید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

اس مملکت میں ابھی تک ہماری امید کے چراغ جل رہے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس قوم کا رخ درست کر دے' زبردستی اسے سیدھے راستے پر ڈال دے اور اسے اس منزل کی جانب موڑ دے جس پر پہنچنے کے ارادے سے سفر کا آغاز کیا گیا تھا کہ ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو"۔ اس لئے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ یہ ملک بے شمار قربانیاں دے کر بنا تھا۔ اسلام کے نعرے سے وجود میں آیا تھا اور پھر اس خطے کی چار سو برس کی تاریخ میرے سامنے ہے۔ گیارہویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک چار سو برس کا تجدیدِ دین کا جو سارا اثاثہ ہے اس کی وارث یہی سرزمینِ پاک و ہند ہے۔ حضرات مجدد الف ثانیؒ' شاہ ولی اللہ دہلویؒ' سید احمد بریلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جیسے مجددینِ ملت اسی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ چودھویں صدی ہجری کے دوران شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے علاوہ علامہ اقبال جیسے مفکر' مولانا مودودی جیسے مصنف اور مولانا الیاس جیسے مبلغ کے برابر کی شخصیتیں پورے عالم اسلام میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ بہت بڑا ورثہ ہے' بہت بڑی وراثت ہے جس کی یہ قوم امین ہے۔

اس ضمن میں بھارت کے مسلمان نے تو پاکستان بنوا کر گویا اپنا فرضِ کفایہ ادا کر دیا تھا' اب ذمہ داری کا سارا بوجھ پاکستانی مسلمان کے کندھے پر ہے۔ اسے کاش کہ احساس ہو جائے' کاش کہ ہوش آجائے۔ لیکن اگر یہ ملک ہی ٹکڑے ہو گیا' ملکی سالمیت ہی باقی نہ رہی' کوئی حصہ سندھو دیش بن گیا' کوئی گریٹر بلوچستان میں ضم ہو گیا' کوئی پختونستان میں جذب ہو گیا اور کوئی سکھا شاہی کی نذر ہو گیا تو قیامِ نظامِ اسلام کا خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا؟ میں نے سکھا شاہی کی بات اس لئے کی ہے کہ میں یہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچا اور اس کی Balkanization ہوئی، تو

سب سے بڑی آفت پنجاب پر آئے گی اور وہ آفت سکھا شاہی کے دوبارہ لوٹ آنے کی صورت میں ہوگی' اس لئے کہ سکھ اِس وقت بہت بڑی زندہ قوم بن چکے ہیں۔ انہوں نے خالصتان کی تحریک کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ اِس دور میں سب سے زیادہ خون افغان قوم نے دیا ہے اور اس کے بعد سکھ قوم نے' اور یہ حقیقت ہے کہ جو قوم خون دینا سیکھ لے اس میں بڑی جان پیدا ہوجاتی ہے۔ اور یہ سکھ قوم اگر کبھی اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کی یلغار کا رخ مغربی پنجاب کی طرف ہوگا۔ ستلج کے پار تو اس کی عظمت کبھی رہی ہی نہیں۔ اس کی اصل عظمت کے نشان تو اسی مغربی پنجاب میں ہیں۔ ان کے ہیرو رنجیت سنگھ کی سمادھی لاہور میں بادشاہی مسجد اور قلعے کے درمیان موجود ہے۔ اسی طریقے سے بابا گرو نانک کی جنم بھومی ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ میں ہے۔ پنجہ صاحب شمالی پنجاب میں ہے۔ ہری پور' ہری سنگھ نلوہ کا آباد کردہ شہر ہے اور مانسہرہ راجہ مان سنگھ کا "سہرا" ہے۔ ان کی تو ساری عظمتِ رفتہ کی تاریخ یہیں سے وابستہ ہے' اُدھر کیا ہے؟ تو اللہ نہ کرے' خاکم بدہن' خاکم بدہن' اِس ملک کو اب کوئی زک پہنچی تو سب سے بڑا نقصان پنجاب کو برداشت کرنا ہوگا' کیونکہ اس کے حصے میں سکھا شاہی آئے گی۔ باقی جس کا جو حشر ہوگا وہ ہوگا۔ سندھ شاید سب سے زیادہ نفع میں رہے کہ وہ ساحل سے ملحقہ علاقہ ہے' خشکی میں محصور (Land Locked) تو نہیں ہے۔ بلوچستان بھی نفع میں رہے گا کیونکہ اس کے پاس ساحل کے علاوہ بے حساب معدنی دولت بھی ہے جس کی وہ بڑی سے بڑی قیمت وصول کر سکتا ہے۔ پٹھانوں کے لئے پختونستان بن سکتا ہے جس کے لئے نسلی اور لسانی بنیاد موجود ہے۔ گویا وہی بات ہوگی جو کبھی اکبر الٰہ آبادی نے کہی تھی۔

مرزا کے اتحاد کو مجلس کی ہائے ہے
ہندو کے اتحاد کو گنگا ہے گائے ہے
پَرشیخ جی کے واسطے مرکز کوئی نہیں
ہر پیر ہر جواں کی جداگانہ رائے ہے

بہرحال اللہ نہ کرے کہ وہ برا دن آئے۔

اور میں یہ مشورہ جو دیتا ہوں کہ اس ملک میں دنیا کے مسلّمہ معیارات کے مطابق منصفانہ اور غیرجانبدارانہ انتخابی عمل کو جاری رہنا چاہئے وہ اسی لئے ہے کہ اگرچہ اس

عمل سے اسلام نہیں آئے گا' لیکن یہ ملک تو باقی رہے گا اور اس کے استحکام کے لئے اسلام کی جدوجہد کرنے کے مواقع باقی رہیں گے' اور اگر خدانخواستہ اس ملک کے حصے بخرے ہوگئے' یا خاکم بدہن کہیں یہاں اغیار کی بالادستی قائم ہوجائے تو معاذاللہ ثم معاذاللہ' ہوسکتا ہے یہاں سپین کی تاریخ دہرائی جائے اور صرف بوسنیا سے نہیں بلکہ جنوبی ایشیا سے بھی مسلمانوں کے خاتمے کے لئے ان کے نسلی صفایا (Ethnic Cleansing) کا وہی عمل شروع ہوجائے۔ میری کتاب "استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ" میرے ان مضامین پر مشتمل ہے جو پہلے "جنگ" میں چھپے تھے۔ اس کتاب کے سیکنڈ ٹائٹل پر میں نے یہ جملہ لکھا تھا کہ "۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء میں اسلام بیک وقت برعظیم ہند میں براستہ سندھ (محمد بن قاسمؒ کی قیادت میں) اور برِعظیم یورپ میں براستہ سپین (طارق بن زیادؒ کی قیادت میں) داخل ہوا تھا۔ سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے پانچ سو برس ہوچکے ہیں۔ کیا اب وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جانے والی ہے؟" ---- آپ کو معلوم ہے کہ سپین میں مسلمانوں کی حکومت ۸۰۰ برس تک رہی تھی لیکن پھر وہاں سے اسلام اور مسلمانوں کا صفایا ہوگیا۔ خدانخواستہ' خدانخواستہ اگر پاکستان قائم نہ رہا تو بعینہٖ وہی تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور اس علاقے سے اسلام' پاکستان اور مسلمانوں کے نام کا خاتمہ ہوجائے گا۔ میرا یہی احساس مجھے مجبور کرتا ہے کہ ملکی سیاسی حالات کے تناظر میں جو بھی سیاسی مشورہ میں صحیح سمجھتا ہوں وہ میں دیتا ہوں اور اسے اپنا ایک دینی فریضہ سمجھ کر دیتا ہوں۔

اس سلسلے کی آخری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ ملک کی سیاسی صورت حال میں اس وقت جو تبدیلی آئی ہے اس کا بھی ہمیں پوری طرح شعور حاصل ہونا چاہئے۔ اس تبدیلی کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ نواز شریف صاحب بھی اپنی ذاتی حیثیت میں ایک قومی قائد بن کر سامنے آچکے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے ہاں ایک خلا تھا' کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہاں سیاسی قوت ایک ہی ہے اور وہ ہے بے نظیر اور پیپلزپارٹی۔ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری سیاسی قوت موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پیپلزپارٹی کا مقابلہ ہمیشہ آئی جے آئی جیسے اتحاد بنا کر کیا گیا۔ لیکن اب نواز شریف صاحب اپنی ذاتی حیثیت میں ایک قومی لیڈر بن چکے ہیں اور ملک کا ایک خاص طبقہ یعنی تاجر اور صنعت کار طبقہ ان کی پشت پر

ہے اور شہروں کے اندر سیاست اسی طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نواز شریف صاحب کے لئے فریش مینڈیٹ لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔ میں نے انہیں ایک مشورہ اُس وقت بھی دیا تھا جب مرکز میں بے نظیر کی حکومت بنی تھی اور وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ بنے تھے کہ خدا کے لئے آپ وزارتِ اعلیٰ کو اہمیت نہ دیں' بلکہ آپ مسلم لیگ کو منظم کریں۔ خدا نے آپ کو اس کی صلاحیت دی ہے' آپ محنت کر سکتے ہیں' بھاگ دوڑ کر سکتے ہیں لہٰذا آپ پارٹی کو منظم کریں۔ آج میں ان کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ انہیں عام انتخابات کروا کے نئے سرے سے عوامی مینڈیٹ حاصل کر لینا چاہئے۔ اِس وقت ملک میں ان کے حق میں جتنی فضا سازگار ہے شاید اس کے بعد یہ پوزیشن برقرار نہ رہے۔ اس لئے کہ چاہے پارلیمانی سیاست ہو یا صدارتی سیاست' دنیا کے مروجہ اور مسلمہ سیاسی معیارات کے اعتبار سے جمہوری نظام میں دو مستحکم سیاسی پارٹیوں کا ایک دوسرے کے مدمقابل ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک ہی پارٹی ہوگی تو سیاست کی گاڑی نہیں چلے گی۔ سیاست کے میدان میں ابھی مونو ریل (Monorail) دریافت نہیں ہوئی۔ اس میدان میں تو دو پہیے چاہئیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب ان میں وہ بصیرت بھی پیدا ہو چکی ہے جو ایک سیاسی قائد کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ انہوں نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ اب ہمیں یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں کہ کون مارشل لاء کی چھتری کے نیچے پروان چڑھا اور مارشل لاء کا سہارا لے کر اقتدار میں آیا تھا۔ چونکہ ان کو یہ گالی دی جاتی تھی کہ یہ تو درحقیقت ضیاء الحق صاحب کے پروردہ ہیں' ان کے مارشل لاء کا دودھ پی کر جوان ہوئے ہیں تو انہوں نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے کہ بے نظیر کا باپ ذوالفقار علی بھٹو بھی تو مارشل لاء کی چھتری کے نیچے پروان چڑھا تھا۔ اور جب اس کی حکومت بنی تھی تب بھی سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے۔ لہٰذا ان بحثوں کو چھوڑ دو' ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب تو آگے کی بات کرنی چاہئے کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابل آئیں' الیکشن لڑیں' ایک کو حکومت کا مینڈیٹ ملتا ہے تو دوسرا اسے تسلیم کرے اور اپوزیشن کا کردار ادا کرے۔ اپوزیشن کا رول بھی مثبت ہونا چاہئے' جو آج کل کے سیاسی عمل کے لئے ضروری ہے۔ میں اس تبدیلی کو اس اعتبار سے خوش آئند قرار دے رہا ہوں کہ اب ہمارے ملک کی پارلیمانی سیاست کی گاڑی پٹڑی پر چڑھ سکتی ہے جو کہ پٹڑی سے اتر گئی تھی

البتہ اس تبدیلی کا دوسرا پہلو تشویشناک ہے اور وہ اس اعتبار سے کہ اس ملک میں پہلی مرتبہ تاجروں اور صنعت کاروں کو ایک ہیرو ملا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نواز شریف صاحب کی سیاست کا اصل محور تاجر برادری اور صنعت کار ہیں۔ اب تک یہ تاجر برادری اور صنعت کار پیپلزپارٹی کے مقابلے میں کچھ دوسری مذہبی اور دینی جماعتوں سے تعاون کرتے تھے' انہیں اپنی حمایت کا یقین دلاتے تھے' انہیں چندے دیتے تھے' ان کے لئے استقبالئے منعقد کرتے تھے۔ یہ سب اس امید پر تھا کہ یہ مذہبی جماعتیں ان کے لئے پیپلزپارٹی کے مقابلے میں ڈھال ثابت ہوں گی۔ چونکہ پیپلزپارٹی کے دورِ حکومت میں نیشنلائزیشن کے نام پر صنعت کاروں کو خاص طور سے اپنے کارخانوں سے محروم ہونا پڑا تھا' لہٰذا اس سے بچاؤ کے لئے وہ مذہبی جماعتوں کی چھتری کے نیچے پناہ ڈھونڈتے تھے۔ لیکن اب وہ وہاں سے کھسک کر نواز شریف صاحب کے تھیلے میں جا رہے ہیں۔ اس سے مذہبی قوتوں کو ضعف پہنچنے کا حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس پر تو مجھے کوئی تشویش نہیں ہے' بلکہ جو مذہب کے نام پر اپنی دکان چمکا رہے تھے انہیں تشویش ہو گی' لیکن مجھے بھی اس اعتبار سے تشویش ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ سود حرام ہے' لیکن اس کے بغیر معیشت کی گاڑی نہیں چلتی۔ یہ کلمہ دینی اعتبار سے بہت بڑا باغیانہ کلمہ ہے اور یہ انتہائی تشویشناک امر ہے کہ یہ بات اب تاجروں اور صنعت کاروں کی زبان پر بلا جھجک آجاتی ہے۔ وہ برملا کہہ دیتے ہیں کہ سود ہماری معیشت کا لازمی جزو بن چکا ہے' اس کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی اور ہمیں اپنی گاڑی چلانی ہے۔ آپ اپنے فتوے اپنے پاس رکھئے! یہ انداز یقیناً اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے خوفناک ہے۔

مزید برآں اب نواز شریف صاحب اسلام کا نام بھی نہیں لیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے حالات کو بھانپ لیا ہے اور انہیں محسوس ہو گیا ہے کہ عام آدمی کو تو صرف اپنی معاشی بہتری سے دلچسپی ہے' لہٰذا اب اپنی حالیہ تقریروں میں انہوں نے اسلام کا نام تک نہیں لیا۔ دوسری طرف انہیں اس کا بھی خطرہ ہے کہ اگر اسلام کا نام لیا تو امریکہ کے کاغذات میں فنڈا مینٹلسٹ کی حیثیت سے نام درج ہو جائے گا اور یہ دھمکی تو خود امریکہ کا ایئر چیف یہاں آکر دے گیا ہے کہ امریکہ کی حیثیت اِس وقت ایک مست ہاتھی کی سی

ہے' جو بھی اس کے سامنے آئے گا کچلا جائے گا۔ چنانچہ اب نواز شریف صاحب اسلام کے نعرے اور اسلام کے نام سے بھی کنی کتراتے ہوئے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ملک میں سود کو اتنے وسیع پیمانے پر عام کردیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ "روزگار سکیم اور بیلو کیب" کے نام پر لاکھوں نوجوانوں کو سودی کاروبار میں ملوث کردیا ہے۔ اب تک تو صرف تاجر' صنعت کار اور کاروباری لوگوں کی اس پر اجارہ داری تھی کہ بنکوں سے قرضے لیں اور کاروبار چمکائیں۔ نواز شریف صاحب نے خود کہا ہے کہ یہ درست ہے کہ ہم نے کارخانے بنائے ہیں' لیکن ہم نے قرضے لئے' ان پر سود ادا کیا۔ گویا کہ دھڑلے سے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے یہ حرام کام کیا اور اس کی بناء پر ہم نے اپنے کاروبار چمکائے۔ اب نواز شریف صاحب مغرب کے کاروباری اصولوں کو اپناتے ہوئے فری مارکیٹ اکانومی قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر سرمایہ کاری کی دعوت دے رہے ہیں۔ امریکہ نے تو خود ہی امداد بند کردی تو آپ نے "کشکول توڑ دیا" لیکن اس کے بدل کے طور پر آپ ملٹی نیشنلز کو جو لا رہے ہیں تو یہ امریکہ سے بڑی لعنت ہیں۔ ان کی اکثریت یہود کی آلۂ کار ہے جو اپنے ہتھکنڈوں سے ملکوں کی معیشت کو تباہ کرکے رکھ دیتے ہیں۔ مجھے نعیم صدیقی صاحب کی ایک نظم کے چند مصرعے یاد آرہے ہیں جو انہوں نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں کہی تھی۔

ڈالر مرے اس دیس کو برباد نہ کرنا!
تُو آئے جو ڈالر ، آئے گا جُوا بھی
. . . . . پھیلے گا زنا بھی

اور یہاں کارخانے تو لگیں گے لیکن عوام کی حالت یہ ہوگی کہ ع

کپڑے تو بنیں گے' تن کم ہی ڈھکیں گے

کیونکہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں تو یہی کچھ ہوتا ہے اور اس کا نقشہ آپ جاکر امریکہ میں دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں غلاظت کے ڈھیروں پر بھی انسان رہ رہے ہیں' جبکہ کچھ لوگوں کے پاس اس قدر دولت ہے کہ وہ چالیس چالیس بلین ڈالر کا ایک چیک لکھ سکتے ہیں۔ تو مغربی سرمایہ دارانہ نظام اپنانے سے تو یہی کچھ ہوگا کہ دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا چلا جائے گا اور سود کی لعنت جسے قرآن "اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کا الٹی میٹم"

قرار دیتا ہے' ملکی معیشت کے رگ و ریشے میں سرایت کرتی چلی جائے گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارا عام آدمی بھی سود کے حق میں بات کرتا ہے۔ یہ صورت حال ہمارے لئے تشویش کا باعث ہے۔ لیکن بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ سیاست میں جمود نہ ہو اور ملکی سیاست کی گاڑی دو پہیوں پر چلے۔ ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی حکمتِ عملی اور طریق کار پر نظرثانی کریں۔

پاکستان کی مذہبی جماعتوں کا جائزہ

اپنی گفتگو کے آخری حصے میں مجھے پاکستان کی مذہبی جماعتوں کے بارے میں اپنا جائزہ پیش کرنا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذہبی جماعتوں سے میری مراد مذہبی سیاسی جماعتیں ہیں۔ قبل ازیں میرے بعض خطابات اور انٹرویوز کی اخباری رپورٹنگ سے بعض مذہبی حلقوں نے بڑا برا منایا ہے' لہٰذا یہ وضاحت کر رہا ہوں کہ وہ مذہبی جماعتیں جو تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہی ہیں یا اصلاحِ عقائد اور اصلاحِ اعمال وغیرہ کی نوعیت کے کام کر رہی ہیں وہ ہماری اس بحث سے خارج ہیں۔ میں چونکہ پاکستان کی سیاست کے بارے میں اپنا موقف بیان کر رہا ہوں لہٰذا اس اعتبار سے ان مذہبی جماعتوں کے بارے میں بھی جن کا اس ملک میں کوئی سیاسی رول بھی ہے' اپنا موقف بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ملک میں "دینی اور انقلابی تحریک" صرف ایک تھی اور وہ جماعت اسلامی تھی۔ یہاں "دینی" اور "انقلابی" کے الفاظ کی اہمیت پیش نظر رہے۔ میرے نزدیک جماعت اسلامی ایک "مذہبی" نہیں "دینی" اور ایک "سیاسی جماعت" نہیں بلکہ "انقلابی تحریک" تھی۔ لیکن اب جو صورت حال ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ اس نے سیاست کے میدان میں آ کر اپنا "دینی" اور "انقلابی" ہونے کا کردار داغدار کر لیا ہے۔ باقی سب مذہبی جماعتوں میں دو وصف لازمی طور پر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ "دینی" نہیں "مذہبی" ہیں یعنی ان کے سامنے نظام کا تصور نہیں ہے بلکہ دین صرف شریعت کے درجے میں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ فرقہ وارانہ ہیں اور فرقہ وارانہ بنیاد پر سیاست کرتی ہیں۔ اہلحدیث' بریلوی اور دیوبندی مسلک کی جماعتیں اپنے اپنے فرقے کے نعرے لگا کر ووٹ لیتی ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں ان کے کچھ فرقہ وارانہ اثرات اور کچھ دائرۂ اثر و نفوذ ہے وہی ان کا سیاسی دائرۂ کار ہے۔ میرے نزدیک ان کی

اصل حیثیت علماء کی ٹریڈ یونینز کی ہے۔ جیسے ہر شعبے کی ٹریڈ یونینز ہوتی ہیں' ڈاکٹروں کی یونینز' کلرکوں کی یونینز' اساتذہ کی یونینز' اسی طرح چونکہ مذہب بھی ہمارے ہاں ایک پیشے (Profession) کا درجہ اختیار کر گیا ہے لہٰذا ان فرقہ وارانہ مذہبی جماعتوں کی حیثیت بھی ٹریڈ یونینز کی ہے' البتہ جہاں کہیں ان کا حلقہ اثر ہے وہاں یہ سیاست بھی کرتی ہیں۔ تاہم ایک جماعت اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ خالص غیر سیاسی بھی ہے اور فرقہ واریت سے بالاتر بھی' مزید برآں تحریک بھی ہے اگرچہ انقلابی نہیں۔ یہ تبلیغی جماعت ہے۔ یہ ایک مذہبی تحریک ہے' ان کے ہاں دین یا نظام کا تصور نہیں ہے۔ ان کا سارا تصور مذہبی ہے جو عبادات' اتباعِ سنت اور فضائلِ اعمال وغیرہ تک محدود ہے۔ اسے آپ ایک اصلاحی تحریک کہہ سکتے ہیں لیکن دینی تحریک اس معنی میں نہیں کہ نظام کو بدلنے میں کوشاں ہو۔

ان سب کے بعد چوتھے نمبر پر ہماری تنظیم اسلامی یا تحریک خلافت ہے جو حجم کے اعتبار سے ابھی کسی شمار قطار میں نہیں۔ ہمیں چاہے کوئی پانچواں سوار کہہ لے چاہے ساتواں سوار کہہ لے یا کوئی اور توہین آمیز لفظ استعمال کرنا چاہے ہمیں قبول ہے۔ میں اپنے بارے میں یا تنظیم اسلامی کے بارے میں یا تحریک خلافت کے بارے میں کسی مغالطے کا شکار نہیں ہوں۔ لیکن اصولی اعتبار سے تنظیم اسلامی علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کے دینی انقلابی فکر کا تسلسل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس اصولی انقلابی فکر کے ساتھ تبلیغی جماعت کا تدیّن' اس کا تعبّدی انداز' عبادات سے شغف اور اتباعِ سنت کے جذبہ کا عنصر جمع کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ ہم اس میں کس درجے میں کامیاب ہوں گے یا ہوئے ہیں تو اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے' بلکہ یہ فیصلہ تو وقت کرے گا یا مستقبل کا مؤرخ۔ تاہم مجھے یہ یقین حاصل ہے کہ اپنی اس نیت اور ارادے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخ رو ہوں گا کہ میں نے اپنے امکان بھر جو کوشش کی تھی وہ یہ تھی کہ جماعت اسلامی کے اصولی دینی انقلابی فکر اور تبلیغی جماعت کے تعبدی انداز کو ایک جماعت میں جمع کر دیا جائے۔ یعنی یہ تصور بھی واضح رہے کہ دین اور دنیا ایک وحدت ہیں اور دین کے اجتماعی نظام کو قائم کرنا اور دین کے غلبہ کی جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے لیکن یہ جدوجہد کرتے ہوئے عبادات سے شغف اور اتباعِ سنت کے رنگ کو اپنی شخصیتوں کے اندر پختہ کیا جائے' گہرا اتارا جائے۔

مولانا مودودی مرحوم سے اتفاق اور اختلاف

چونکہ فکری اعتبار سے ہمارا سب سے قریبی رشتہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ ہے' لہٰذا اس حوالے سے ان کا ذکر میری تقریروں اور تحریروں میں بار بار آتا ہے۔ بہت سے لوگ اس پر ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں' کچھ خیر خواہانہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ آپ نے جو بات کہنی تھی وہ ایک بار کہہ دی' بار بار کہنے سے کیا فائدہ؟ آج اپنی گفتگو کو مکمل کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں بھی کچھ باتیں مثبت طور پر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ اس پر ہمارا موقف واضح ہو جائے۔

جہاں تک مولانا مودودی کے اساسی فکر کا تعلق ہے اس کو میں قریباً صحیح سمجھتا ہوں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں انہوں نے "خلافت و ملوکیت" نامی جو کتاب لکھی تھی اس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ لیکن ان کے جس فکر پر ۱۹۴۱ء میں جماعت قائم ہوئی تھی اس سے مجھے اگر سو فیصد نہیں تو ۹۰ - ۹۵ فیصد اتفاق ضرور ہے۔ اور میرے نزدیک یہ فکر دراصل علامہ اقبال ہی کے فکر کا تسلسل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بے نظیر کے اس بیان پر شدید گرفت کی تھی کہ "ہمیں مودودی کا اسلام نہیں' علامہ اقبال کا اسلام چاہئے"۔ میں نے کہا تھا کہ مولانا مودودی اور علامہ اقبال دونوں کا اسلام ایک ہے اور ان دونوں میں تفریق کرنا بڑی عیاری اور مکاری کی بات ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن سے لاہور بلانے والے علامہ اقبال ہی تھے۔ مولانا مودودی تو حیدر آباد دکن سے رسالہ نکالتے تھے اور کتابیں شائع کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے انہیں حیدر آباد دکن سے لاہور منتقل ہونے کی دعوت دی' کیونکہ وہ ۱۹۳۰ء میں یہ خواب دیکھ چکے تھے کہ اس علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوگی۔ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں ان کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ یہ بات نوشتۂ تقدیر ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوگی۔ علامہ اقبال ہی کے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی خان نے انہی کے کہنے پر پٹھان کوٹ میں ادارہ دارالاسلام بنایا اور وہاں آکر مولانا مودودی نے قیام کیا۔ اگر مولانا مودودی کے اسلام سے اقبال کو اختلاف ہوتا تو کیا وہ مولانا مودودی کو نقل مکانی کے لئے دعوت دے سکتے تھے اور انہیں یہاں پاؤں جمانے کے لئے مدد دے سکتے تھے؟ تو کم سے کم ۱۹۳۸ء تک جب علامہ اقبال کا

انتقال ہوا، یا ۱۹۳۷ء تک کہہ لیجئے جب علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو نقل مکانی کی دعوت دی، مولانا مودودی نے جو کچھ لکھا تھا اس کے ساتھ علامہ اقبال کو کامل اتفاق تھا۔ بہرحال میرے نزدیک مولانا مودودی کا فکر دراصل فکرِ اقبال ہی کی بڑے عمدہ پیرائے اور سلیس انداز سے تشریح و توضیح ہے۔ فکرِ اقبال کے بارے میں میرے مضامین نوائے وقت میں "تفکر و تذکر" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، جنہیں پھر یکجا کرکے میثاق میں بھی شائع کیا جا چکا ہے۔ ان میں میں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ اس صدی میں اسلام کو از سرِنو دین کی حیثیت سے پیش کرنا اقبال کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ پھر اس کے لئے عملی جدوجہد شروع کرنے کا سہرا ابوالکلام آزاد کے سر ہے۔ یعنی ۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۲۰ء تک "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام۔ میرے نزدیک یہ تین شخصیتیں اس اعتبار سے بہت نمایاں ہیں: علامہ اقبال، مولانا آزاد اور مولانا مودودی۔ فکر میں یہ تینوں تقریباً ایک ہیں، انیس بیس کا فرق تو ہوتا ہے اور اس فکر سے مجھے ۹۰-۹۵ فیصد اتفاق ہے۔

جہاں تک مولانا مودودی کے عملی رویّے کا تعلق ہے، اس سے مجھے کتنا اتفاق ہے اور کتنا اختلاف ہے، یہ میں تین درجوں میں واضح کرکے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا مودودی کی زندگی کے جو مختلف ادوار ہیں ان میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کے آٹھ سالہ دور سے مجھے ۸۵ فیصد اتفاق ہے، ۱۵ فیصد اختلاف ہے۔ مولانا مرحوم نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کی، لیکن اس سے قبل ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء میں وہ اپنا فکر ترجمان القرآن میں پیش کر چکے تھے۔ انہی اصولوں پر انہوں نے جماعت بنائی اور ۱۹۴۷ء تک انہی اصولوں پر چلتے رہے۔ اس سے اکثر و بیشتر مجھے اتفاق ہے۔ صرف تین چیزوں میں معمولی سا اختلاف ہے۔

اولاً ——— ایمان اور اس کی باطنی کیفیات پر جتنا زور دیا جانا چاہئے تھا اتنا نہیں دیا، اور تقویٰ اور تدیّن کی جتنی ناگزیر اور کم از کم ضرورت تھی ان کا اتنا اہتمام بھی نہیں کیا گیا، حالانکہ دین میں ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ اسلام کا اگر ایک ظاہر ہے تو اس کا ایک باطن بھی ہے۔ نماز کا ظاہر قیام اور رکوع و سجود ہے تو اس کا باطن خشوع و خضوع ہے، جو اس کی اصل روح ہے۔ نماز کے ظاہر کا علم فقہ کی کتابوں سے حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اس کی اصل روحِ باطنی کا علم یا تو صوفیاء کی کتابوں میں ملے گا یا حدیث کی کتابوں میں۔

نماز میں خشوع و خضوع کی یہ کیفیت مطلوب ہے کہ جب سجدے میں سر رکھا جائے تو محسوس یہ ہو کہ اپنے رب کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی تو اگرچہ سجدہ تو ہو گیا لیکن وہ بے روح سجدہ ہوا۔ وہ سجدہ نہ ہوا جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

آج منبر پر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر تقریریں کرنے والے بہت ہیں اور محراب میں کھڑے ہو کر بڑی اعلیٰ قراءت کے ساتھ امامت کرنے والے بہت ہیں لیکن یہ منبرو محراب آج اس سجدے کو ترس گئے ہیں جس سے روحِ زمیں لرز اٹھتی تھی!

ثانیاً ——— مولانا مودودی مرحوم نے تحریک پاکستان کی جس شدت سے مخالفت کی اتنی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ مولانا کا یہ فرمانا اپنی جگہ بالکل درست تھا کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی قومی ریاست تو وجود میں آ جائے گی' لیکن اس راستے سے اسلام نہیں آئے گا۔ یہ بات تو ڈنکے کی چوٹ کہنی چاہئے تھی' لیکن قومی تحریک کی اتنی شدت سے مخالفت کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا کہ اسے غیر اسلامی قرار دے دیا جائے' کیونکہ مسلمانوں کی آزادی اور ان کے لئے ایک علیحدہ ملک کی جدوجہد کوئی برا کام نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل جیسی بگڑی ہوئی قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلوائی۔ لہٰذا مسلمانانِ ہند کے بڑے حصے کے لئے آزادی کی تحریک چلانا کوئی غلط کام نہیں تھا۔ اور مسلمانوں کی دنیوی فلاح و بہبود اور ان کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ کی کوشش کو غیر اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک اس میں بھی کچھ انتہا پسندی اور زیادتی کا عنصر شامل تھا۔

ثالثاً ——— مولانا مودودی مرحوم کا اپنا ذہن اگرچہ یہی تھا (اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں) کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت بیعت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہئے اور اس کے امیر کو وسیع اختیارات حاصل ہونے چاہئیں' لیکن بعض اسباب کی بناء پر انہوں نے مغربی جمہوری انداز کا دستور بنا کر ایک دستوری تنظیم بنائی اور پھر "وَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا" کے مصداق اپنی رائے اور مزاجی ساخت کی بنا پر اس

کا حق بھی ادا نہ کرسکے۔ الغرض' ان تین امور کو پانچ پانچ فی صد کے حساب سے جمع کر لیجئے تو پندرہ فی صد اختلاف ہے' ورنہ میں مولانا مودودی کے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء کے طریق کار سے ۸۵ فی صد اتفاق کرتا ہوں۔

لیکن تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی نے جو موقف اختیار کیا اور اضافی طور پر جو دو کام کئے ان میں سے ایک کو میں صد فی صد صحیح سمجھتا ہوں اور دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے کہ کاش مولانا یہی ایک کام کرتے چلے جاتے اور دوسرا کام نہ کرتے جو صد فیصد غلط تھا۔ قیام پاکستان کے بعد صحیح کام دستورِ اسلامی کا مطالبہ تھا۔ انہوں نے اس کے لئے مہم چلائی کہ آپ نے پاکستان اسلام کے نام پر بنایا ہے' اب یہاں دستور بھی اسلامی ہونا چاہئے۔ مولانا مودودی یہ مطالبہ لے کر کھڑے ہوئے تو پوری قوم نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی آواز میں آواز ملائی۔ اور چونکہ اُس وقت تک جماعت اسلامی ایک سیاسی پارٹی نہیں تھی لہٰذا مسلم لیگ کے مخلص لوگوں نے بھی اس مطالبے کی حمایت کی۔ یہاں تک کہ قرار دادِ مقاصد پاس کرانے میں فیصلہ کن کردار مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ادا کیا۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی میں یہ دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے یہ قرار داد پاس نہ کی تو میں ابھی استعفیٰ دے کر جاتا ہوں اور عوام کو بتاتا ہوں کہ مسلم لیگ نے اسلام کا نام لے کر دھوکہ دیا تھا۔ اس دھمکی کی بنیاد پر قرار داد مقاصد پاس ہوئی۔ لیکن وہ جماعت اسلامی کے آدمی تو نہیں تھے' وہ مسلم لیگی تھے' قائداعظم کے سپاہی تھے۔ اسی طرح عمر حیات ملک جو پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے' قائداعظم کے ادنیٰ سپاہی تھے۔ ان لوگوں نے ساتھ دیا کہ یہ اسلام کی بات ہے' یہ کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے' اسلام تو ہم سب کی مشترک متاع ہے۔ اور یہ اسی لئے ہوا کہ اُس وقت تک اسلام ایک پارٹی ایشو نہیں بنا تھا۔ اسی راستے پر قدم آگے بڑھنے چاہئیں تھے اور یہی ایک کام جاری رہنا چاہئے تھا۔ قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد اسلامی دستور کی طرف عوامی دباؤ کے ساتھ قدم بقدم آگے بڑھنا چاہئے تھا' اس کے لئے رائے عامہ کو مزید منظم کر کے اس میں تمام طبقات کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن دوسرے قدم نے بیڑہ غرق کر دیا۔ ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں حصہ لے کر جماعت اسلامی ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت اختیار کر گئی اور اس طرح اس نے مذہب کو ایک پارٹی ایشو بنا دیا۔ اب جماعت

اسلامی کی حیثیت مسلم لیگ کی حریف سیاسی جماعت کی ہو گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی ہر بات کو ایک مخالف کی بات سمجھا گیا۔ اب بھلا مسلم لیگی جماعت اسلامی کی بات کی تائید کیسے کرتے؟ اللہ تعالیٰ مولانا مودودی کو معاف فرمائے' انہوں نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا' لیکن میرے نزدیک یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ مولانا مودودی ۱۹۵۱ء میں انتخابی میدان میں اترے اور پنجاب کے الیکشن میں حصہ لیا۔ اس اقدام نے انہیں ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے سیاسی اکھاڑے کا پہلوان بنا کر اسلام کو ایک پارٹی ایشو اور الیکشن ایشو بنا دیا۔ یہ میرے نزدیک اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے اس ملک میں بہت بڑی بدقسمتی کا آغاز تھا۔

جماعت اسلامی کے تیسرے دور کا آغاز ۱۹۵۸ء سے ہوتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد مولانا مودودی مرحوم نے جو لائحہ عمل اختیار کیا وہ ۵۰ فیصد درست تھا اور ۵۰ فیصد غلط۔ درست یہ کہ مارشل لاء کی مخالفت کی' جو آج ہم بھی کر رہے ہیں' کیونکہ مارشل لاء اس ملک کے لئے زہرِ قاتل ہے ---- لیکن ۵۰ فیصد غلطی یہ ہوئی کہ بحالیٔ جمہوریت کے لئے سیکولر قوتوں کے ساتھ مل کر اپنی ساری توانائی اسی کام میں صرف کر دی۔ حالانکہ دیکھنا یہ چاہئے تھا کہ سیکولر جماعتوں کی جدوجہد سے جو جمہوریت آئے گی وہ تو سیکولر جمہوریت ہو گی' آپ کا اس میں کیا بھلا ہو گا؟ اور اسلام کا اس میں کیا بھلا ہو گا؟ لیکن مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے گیارہ سالہ ایوبی دور (۱۹۵۸ء -- ۱۹۶۹ء) میں اپنی تمام مساعی اسی بحالیٔ جمہوریت کی تحریک میں وقف کئے رکھیں۔ اس کا نقصان جماعت کو یہ ہوا کہ اس کی اپنی تنظیمی بنیادیں مستحکم نہیں ہوئیں اور اپنے کارکنوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی جا سکی جس کے نتیجے میں وہ اصل قوت فراہم نہیں ہو سکی کہ اپنے بل پر کھڑے ہو کر باطل نظام کو چیلنج کیا جا سکے' بلکہ اپنی قوتیں ضائع کر دیں۔ مولانا مودودی مرحوم کی زندگی میں جماعت کے یہ تین دور ہیں۔

جماعت اسلامی کے چوتھے دور کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جب مولانا مودودی نے جماعت کی امارت چھوڑ دی اور میاں طفیل محمد صاحب امیرِ جماعت بنے۔ یہ چوتھا دور گو مگو کا دور ہے۔ اس سے پہلے گیارہ سالہ دور میں جمہوریت کے لئے جہاد کیا گیا تھا اور مارشل لاء کی مخالفت کی گئی تھی' لیکن اس دور میں ضیاء الحق صاحب کے مارشل لاء سے

تعاون کیا گیا۔ اس کے بارے میں میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ البتہ اس کے بعد جو دور آیا ہے جس میں قاضی حسین احمد صاحب منظر عام پر آئے ہیں اس کے بارے میں میں کچھ اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

قاضی حسین احمد اور ان کی آراء

میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے، آج پھر کھل کر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ قاضی صاحب جوان ہیں، باہمت ہیں، ان میں حرکت ہے، اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ اور جس طرح میں نے نواز شریف صاحب کے بارے میں کہا اسی طرح قاضی صاحب کے بارے میں بھی کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنی ذاتی حیثیت میں قائد بن کر ابھرے ہیں (He is a leader in his own right) وہ جماعت اسلامی میں امارت کے منصب پر اپنی ذاتی حیثیت سے فائز ہوئے ہیں۔ وہ مولانا مودودی کے اشارے سے یا کسی اور کے کہنے سے امیر نہیں بنے۔ شروع میں ان کے اندر جوش زیادہ، ہوش کم تھا۔ چنانچہ ایک دور میں وہ صدام حسین کی رو میں بھی بہہ گئے تھے اور لال قلعہ دہلی پر پرچم لہرانے کی باتیں بھی برسرعام کر رہے تھے حالانکہ ایسی باتیں دل میں ہوں تو بھی زبان پر لانے کی نہیں ہوتیں۔ کسی قائد کو ایسی باتیں زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ دل میں ایسی امنگ ضرور ہونی چاہئے اور اس کے لئے کوشش بھی کرتے رہنا چاہئے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے : **اِسْتَعِیْنُوا عَلَی الْحَوَائِجِ بِالْکِتْمَانِ** یعنی اپنے ارادوں کو مخفی رکھ کر اپنی ضرورتیں پوری کرو۔ یہ نہیں کہ آپ اپنے سارے کارڈ ٹیبل پر رکھ دیں۔ اس سے تو دنیا کو آپ کے خلاف زبان کھولنے کا موقع مل جائے گا۔ اس اعتبار سے ان میں ہوش کی کمی اور جوش کی زیادتی رہی ہے لیکن اب ان میں کچھ سنجیدگی آئی ہے۔

مجھے قاضی حسین احمد صاحب کی تین باتوں سے صد فی صد اتفاق ہے۔ پہلی بات یہ کہ ان کا عالمی حالات کا شعور و ادراک یعنی Global Perception صحیح ہے۔ وہ بالکل درست کہہ رہے ہیں کہ اِس وقت امریکہ پوری دنیا کی سیاست اور معیشت پر چھا گیا ہے۔ بلکہ میں تو اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ یہ دراصل امریکہ نہیں یہودی ہیں جو دنیا پر چھا چکے ہیں۔ امریکہ تو خود ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے۔ بائبل کے عہد نامہ جدید کے آخری حصے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری یوحنا کے مکاشفات درج ہیں، ان میں

دنیا کے آخری دور کے حالات کے مکاشفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بہت بڑا درندہ (Beast) ہوگا جس کے سات منہ اور دس بڑے بڑے سینگ ہوں گے اور اس درندے کے اوپر ایک عورت سوار ہوگی۔ اس مکاشفہ میں دجالی فتنے کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ آج عیسائی دنیا خاص طور پر وائٹ اینگلو سیکسن پروٹیسٹنٹس (WASP) اس درندے کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ ان کی درندگی' ان کی قوت اور ان کے اسلحے کی ایک ہلکی سی جھلک دنیا خلیج کی جنگ میں دیکھ چکی ہے۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے ملک کے خلاف کیسے کیسے دیوہیکل جہاز لے کر آئے تھے' حالانکہ ان کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ وہ چاہتے تھے کہ اس کا اس طور سے بھرکس نکالا جائے کہ ہمارا ایک آدمی بھی نہ مرے' ورنہ اگر یہاں سے لاشوں کی بوریاں (Deadbody Bags) جانا شروع ہوگئیں تو امریکی رائے عامہ قیامت برپا کردے گی۔ بہرحال اس "درندے" کے اوپر اِس وقت یہود سوار ہیں' جنہیں ان کی بزدلی کی وجہ سے مکاشفہ میں عورت کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ خود قرآن کہتا ہے کہ ان میں جرأت اور ہمت نہیں ہے۔ یہ تو دوسروں کے کھونٹے کے اوپر ناچ رہے ہیں۔ ورنہ اگر امریکہ کہیں ایک دن کے لئے ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لے تو آج کا گیا گزرا عرب بھی اسرائیل کی تکابوٹی کرکے رکھ دے اور ۱۹۷۳ء میں مصریوں نے یہ کرکے دکھایا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں مصریوں کی پیشانی پر جو کلنک کا ٹیکہ لگا تھا وہ انہوں نے ۱۹۷۳ء کی رمضان جنگ میں دھو کر دکھا دیا تھا' یہاں تک کہ وہ "بارلیو لائن" عبور کر گئے تھے جس کے بارے میں اسرائیل کو وہم و گمان تک نہ تھا کہ کوئی ان کی اس دفاعی لائن کو بھی عبور کرسکتا ہے۔ لیکن جب امریکہ اس کا پشت پناہ بن کر پہنچا تو اس کا مقابلہ کون کرتا! —— تو قاضی صاحب کا یہ فرمانا درست ہے کہ اِس وقت امریکہ دنیا پر چھایا ہوا ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ پاکستان کی تمام سیاسی قوتیں امریکہ کے سامنے سربسجود ہیں' خواہ وہ بے نظیر اور ان کی پیپلزپارٹی ہو اور خواہ وہ نواز شریف اور ان کے ساتھی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

دوسرے یہ کہ اندرونی طور پر ملک کے بارے میں ان کا یہ ادراک درست ہے جس کا وہ برملا اظہار کر رہے ہیں کہ اس ملک سے جب تک سرمایہ داری اور جاگیرداری کا

جناز نہیں نکلتا حالات بہتر نہیں ہوسکتے۔ جب تک سیاست ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے کوئی مثبت تبدیلی نہیں آسکتی۔ ان کی یہ بات بالکل درست ہے اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے جنازہ نکالنے کی بات ۱۹۹۰ء کے انتخابات سے پہلے بھی کر رہے تھے' لیکن پھر انہی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ آئی جے آئی میں شریک ہوگئے۔ بہرحال Perception کی حد تک ان کی یہ بات درست ہے اور اس سے کون اختلاف کی جرأت کرے گا۔ اس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات

لیکن اس سرمایہ پرستی اور جاگیرداری کا سفینہ ڈبونے کے لئے تو انقلابی جدوجہد کی ضرورت ہے' یہ انتخابی عمل سے کیسے ہوجائے گا؟

تیسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہبی جماعتوں کا متحدہ محاذ بنانے کا کوئی فائدہ نہیں' ایک قائد کی قیادت میں لوگ جمع ہوں گے تو کوئی پیش رفت ہوگی۔ یہ تو وہی بات ہے جو میں کہتا آرہا ہوں اور جس کی وجہ سے میری مخالفت ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے کہا ہے کہ اب ہم جماعتوں کا اتحاد نہیں بنائیں گے' "اسلامک فرنٹ" میں لوگ افراد کی حیثیت سے آجائیں۔ اس کے لئے وہ دوسری دینی جماعتوں کے کارکنوں کو بھی کھینچنا چاہ رہے ہیں۔ اس ضمن میں میری رائے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ "متحدہ شریعت محاذ" کے تجربے کے بعد تنظیم اسلامی نے یہ پختہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب کبھی کسی مذہبی محاذ میں شامل نہیں ہوں گے۔ حدیثِ نبویؐ کی رُو سے مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ ہم نے اُس وقت دیکھ لیا تھا کہ متحدہ محاذ میں جتنی بھی جماعتیں شامل ہیں ان کے اندر کوئی جان نہیں ہے اور وہ منظم ہوکر کام کرنے کے لئے تیار بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں مولانا سمیع الحق صاحب ازراہ کرم چل کر میرے پاس آئے لیکن میں نے ان سے معذرت کردی کہ میں کسی ایسے اتحاد میں شرکت نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا کہ آپ انتخابی سیاست سے پسپائی اختیار کرکے آئیے تو ہم آپ کے قدموں میں ہوں گے۔ لیکن آپ یہ انتخابی کھیل بھی کھیلتے رہیں' سینٹ میں آپ کی سیٹ بھی پکی رہے اور اس کے لئے آپ کا جوڑ توڑ بھی جاری رہے اور ساتھ کے ساتھ آپ ہمارا تعاون بھی چاہیں تو یہ

ناممکن ہے! اس کے بعد پروفیسر ساجد میر صاحب میرے پاس آئے تو میں نے ان سے بھی معذرت کردی۔

بہرحال قاضی صاحب کی یہ تین باتیں وہ ہیں کہ "متفق گردید رائے بو علی بارائے من" کے مصداق ان کے بارے میں میری رائے قاضی صاحب کی رائے سے موافقت رکھتی ہے ------ لیکن میرے نزدیک ان تینوں باتوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ آپ انتخابی میدان سے پسپائی اختیار کریں۔ اس ضمن میں بھی تین ہی باتیں میں عرض کرنا چاہتا ہوں:

پہلی بات یہ کہ میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ کوئی سیاسی حکومت امریکہ کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ سیاسی حکومت کو تو ہر وقت اپنے ارکانِ اسمبلی کی خبر گیری کرنا پڑتی ہے کہ کوئی مینڈک پھدک کر اُدھر تو نہیں چلا گیا' پھر یہ کہ عوام ساتھ ہیں یا نہیں؟ قربانی دینے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں یا نہیں؟ وہ تو انقلابی حکومت ہوتی ہے جو ڈٹ کر کھڑی ہوجاتی ہے اور عوام بھی اس کے پیچھے مرنے کے لئے تیار ہوکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس کے لئے بھی موجودہ دَور میں ہمارے پاس ایک ہی مثال ہے۔ جہاں تک عقائد اور دوسرے مسائل کا تعلق ہے ان میں مجھے شیعیت سے جو اختلاف ہے وہ سب کو معلوم ہے' لیکن میں کیا کروں کہ انقلابی جدوجہد کے ضمن میں عہدِ حاضر میں ایک ایران ہی کی مثال میرے سامنے آتی ہے' کیونکہ اگر بالفعل کچھ کرکے دکھایا ہے تو ایرانیوں نے کرکے دکھایا ہے۔ امریکہ کے مدمقابل بھی اگر کھڑے ہوئے ہیں تو صرف ایرانی کھڑے ہوئے ہیں۔ یا اب سوڈان نے تھوڑی سی ہمت دکھائی ہے اور وہ ایک مثال پیدا کر رہا ہے' جو دیکھتے ہیں کب تک کرسکے گا' لیکن ایران نے امریکہ اور روس دونوں کو شیطان قرار دے کر اور امریکہ کو "شیطانِ بزرگ" اور "شیطانِ اکبر" قرار دے کر عظیم مثال قائم کی ہے۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے پہلے شاہ کے خلاف ایجی ٹیشن میں ہزاروں جانور کی قربانی دی۔ اور پھر عراق کے مقابلے میں ان کے لاکھوں بچوں نے گولیاں کھائیں اور جانیں دی ہیں' جبکہ پوری مغربی قوت عراق کے پیچھے تھی' تمام عرب ممالک عراق کے پشت پناہ تھے' لیکن ایرانیوں کا بچہ بچہ مرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو قوم مرنے کے لئے تیار ہوجائے اسے کوئی ختم نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ جذبہ تو پیدا نہ ہو اور آپ امریکہ کے مقابلے میں کھڑے ہوجائیں' یہ ناممکن ہے! یہ جذبہ انقلابی عمل سے پیدا

ہوتا ہے' آپ انتخابی محاذ بنا کر چاہے کتنے ہی لوگوں کو جمع کرلیں اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

دوسرے یہ کہ اگر آپ دوسری جماعتوں کے مخلص کارکنوں کو کھینچنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کے ساتھ کیسے آئیں گے' جبکہ وہی کام جو آپ کر رہے ہیں وہ خود بھی کر رہے ہیں۔ آپ بھی انتخاب لڑنا چاہتے ہیں اور ان کی جماعتیں بھی انتخاب لڑتی ہیں۔ جمعیت علماء اسلام کا اپنا ایک سیاسی حلقۂ اثر ہے' صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ان کے بڑے مضبوط گڑھ ہیں جہاں عوام ان کے ساتھ ہیں' تو ان کے کارکن اپنی جماعت کو چھوڑ کر آپ کے پاس کاہے کو آئیں گے؟ ہاں آپ انہیں راستہ دوسرا دکھائیں جس کے لئے لوگوں کے اندر امنگ موجود ہے تو وہ آپ کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اس ضمن میں ایک ہوائی سفر کے دوران میری گفتگو ایک صاحب سے ہوئی جن کا تعلق جماعت اسلامی ہی سے ہے اور وہ صوبائی وزیر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نظری طور پر آپ کی بات صد فیصد درست ہے' لیکن یہاں کوئی جان دینے کے لئے میدان میں نہیں آئے گا۔ میں نے کہا کہ آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں' قوم میں جان دینے کا جذبہ تو موجود ہے' کیا لوگوں نے ختم نبوت کے نام پر جانیں نہیں دیں؟ اور انہوں نے دی ہیں جن کا مذہب سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہیں تھا' جنہیں آپ گامے ماجھے کہتے ہیں انہوں نے گریبان کھول کھول کر گولیاں کھائی ہیں۔ پھر حال ہی میں سپاہِ صحابہؓ نے اپنے کارکنوں میں کس طرح جانیں دینے کا جذبہ بیدار کیا ہے۔ تو لوگ تو جان دینے کو تیار ہیں' انہیں قیادت کی ضرورت ہے۔ اس قوم میں اصل کمی جان دینے والوں کی نہیں ہے' بلکہ اصل کمی مستقل اور پیہم کام کرنے والوں کی اور اپنے آپ کو بدلنے والوں کی ہے۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ہمارے عوام کا حال یہ ہے کہ مسجد کی حرمت پر کٹ مریں گے لیکن نماز نہیں پڑھیں گے' رسولؐ کے نام پر جان دے دیں گے لیکن اتباعِ سنّت مشکل کام ہے۔ تو میرا اس قوم کے بارے میں جو مشاہدہ ہے وہ بڑا مختلف ہے۔ تاریخ کا کوئی مرحلہ بتا دیجئے جس پر یہ قوم جان دینے میں پیچھے رہ گئی ہو! لیکن اصل کمی وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا' یعنی اپنے آپ

کو بدلنا۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الرعد:۱۱) ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

لہٰذا اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے مطابق بدلو! اپنے وجود پر اللہ کے خلیفہ بنو اور اس پر اللہ کی حکومت قائم کرو! اپنے گھر میں اللہ کے خلیفہ بنو اور وہاں اللہ کا دین نافذ کرو! حکومت الٰہیہ کا چھوٹا سا نقشہ اپنے گھر کے اندر قائم کرکے دکھاؤ اور پھر باطل کو للکارنے کے لئے میدان میں آؤ تو اسی صورت میں تمام دینی حلقوں کے وہ مخلص کارکن آپ کی جانب کھنچ آئیں گے جو انتخابی سیاست سے تو مایوس ہو چکے ہیں لیکن کوئی متبادل صورت موجود نہ ہونے کے باعث چار و ناچار اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اگر آپ الیکشن میں حصہ لیتے ہیں تو' خواہ آپ جماعت اسلامی کے نام سے الیکشن لڑیں یا اسلامک فرنٹ کے نام سے' اس میں آپ کی اجارہ داری (Monoply) تو قائم ہونے سے رہی۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں آئی جے آئی کی بھی اجارہ داری تو نہیں تھی۔ اگرچہ اس میں بھی ایسے لوگ شامل تھے جن کے بارے میں بعد میں خود آپ نے کہا کہ انہوں نے مذہب کا نعرہ صرف اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا۔ آئی جے آئی سے علیحدگی کے وقت آپ کا نواز شریف پر یہی الزام تھا۔ لیکن اُس وقت بعض مذہبی جماعتیں ایسی بھی تھیں جو آئی جے آئی میں شامل نہیں تھیں۔ مثلاً جے یو آئی (فضل الرحمٰن گروپ) اس سے علیحدہ تھی۔ تو جب بھی آپ انتخاب کے میدان میں اتریں گے تو ووٹ تو لازماً تقسیم ہوں گے' آپ کی اجارہ داری تو قائم نہیں ہوگی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنے خطابات میں یہ باتیں کرتے رہتے ہیں' لیکن جماعت کی قیادت سے ملاقات کرکے ان سے گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ تو میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ میں نے جماعت اسلامی کے دوسرے لوگوں کے علاوہ اس کے تین چوٹی کے قائدین سے ملاقات کرکے ان سے اس ضمن میں گفتگو کی ہے۔ کراچی میں میں نے محمود اعظم فاروقی صاحب سے جو جماعت اسلامی کے سب سے پرانے ایم این اے ہوتے

تھے اور پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب سے جو اب بھی جماعت کے ایک اہم قائد ہیں' ملاقاتیں کیں۔ یہاں پر قاضی حسین احمد صاحب کو خط لکھ کر ان سے ملاقات کا وقت لیا اور پھر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بات کی۔ اس ملاقات میں بھی میں نے حُسنِ اتفاق سے تین ہی نکتے بیان کئے جو میں ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ انتخابات کا میدان چھوڑ کر ایک مزاحمتی تحریک (Resistance Movement) کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھالیں تو آپ کو تین فائدے نقد حاصل ہوں گے:

اولاً یہ کہ ہر انتخاب کے بعد ایک بات جو ہمیشہ سامنے آتی ہے یعنی یہ کہ لوگ مذہبی جماعتوں کو گالیاں دیتے ہیں کہ ان کی آپس کی پھوٹ کی وجہ سے ووٹ تقسیم ہوئے اور بیڑہ غرق ہوا' تو کم از کم آپ تو اس جرم میں شریک نہیں ہوں گے' یہ "Badwill" آپ کے حصے میں تو نہیں آئے گی' لوگوں کا یہ الزام آپ پر تو نہیں آئے گا۔ اور اس طرح آپ جو "Goodwill" حاصل کریں گے یہ آئندہ کسی انقلابی جدوجہد کے لئے بہت قیمتی سرمایہ ثابت ہو گی۔

ثانیاً یہ کہ جماعت اسلامی انتخاب میں حصہ لے یا نہ لے' یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ "ووٹ بینک" تو ہے' لاکھوں کی تعداد میں اس کے ووٹ تو بہرحال ہیں۔ تو تمام مذہبی جماعتیں آپ کی طرف رجوع کریں گی کہ آپ ہمیں ووٹ دیجئے۔ اس طرح آپ کے اور دیگر مذہبی جماعتوں کے مابین کشیدگی کم ہو گی اور بجائے مرکز گریز (Centrifugal) رجحان کے مرکز پسند (Centripetal) رجحان پیدا ہو گا۔ مزید یہ کہ آپ ان سے اپنی شرائط بھی منوا سکیں گے کہ اگر آپ ہماری یہ شرائط پوری کرتے ہیں تو ہم آپ کو ووٹ دیں گے۔ اس سے اتحاد اور خیر کی طرف پیش قدمی ہو گی۔

ثالثاً یہ کہ جب آپ "نہی عن المنکر بالید" کی روش اختیار کریں گے تو دوسری جماعتوں کے مخلص کارکن بھی آپ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ مخلص کارکن ہر جماعت میں موجود ہوتے ہیں۔ غلط پالیسیاں' غلط نقطۂ نظر یا غلط طرزِ عمل کا معاملہ تو چوٹی کی قیادت کی طرف سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر جماعت کے مخلص کارکن آپ کی طرف آئیں گے۔ مجھے اس کا تجربہ ہوا تھا جب ۱۹۸۲ء میں میں نے خواتین کے پردے سے متعلق اسلامی احکام کو برملا بیان کیا اور اس کے جواب میں مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین کی طرف سے میری

مخالفت ہوئی تو دیوبندی' بریلوی اور اہلحدیث تمام مکاتیبِ فکر کی مساجد سے میری بھرپور تائید ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی کے اُس وقت کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے حیدر آباد کے جلسۂ عام میں میری تائید میں فرمایا کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ گورنر سندھ کی بیوی کی قیادت میں مٹھی بھر خواتین نے کراچی ٹی وی سٹیشن کے باہر میرے خلاف مظاہرہ کیا تو اس کے جواب میں جماعت اسلامی حلقۂ خواتین کی طرف سے میری حمایت میں بھرپور مظاہرہ کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں باپردہ خواتین نے شرکت کی۔ تو آپ اس نہج پر کام کریں گے تو آپ کو اس قوم کے اندر سے مدد ملے گی' تعاون ملے گا' رفاقت میسر آئے گی۔

لیکن ـــــ افسوس صد افسوس کہ ان کا پرنالہ اب بھی انتخابی عمل کی طرف ہی بہہ رہا ہے۔ بہرحال میں یہ باتیں کہتا ہوں' کہتا رہا ہوں اور کہتا رہوں گا۔

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

لیکن یہ حقِ نصیحت ہے' حقِ خیر خواہی ہے جو ہمیں اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ادا کرنا ہے۔ یہ نہ تو ان کی بدخواہی ہے اور نہ ہی مخالفت ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آخری وقت تک حق کہنے کی توفیق دیتا رہے۔ باقی یہ کہ لوگوں کا رجوع ہو یا نہ ہو' یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم کس کھیت کی مولی ہیں' دنیا میں کتنے ہی انبیاء ایسے گزر گئے کہ ان کی دعوت کی طرف لوگوں کا کوئی رجوع نہیں ہوا۔ لیکن ان کے لئے یہ نہ تو ناکامی کا مقام تھا اور نہ تشویش کا۔ وہ اس دنیا سے کامیاب و کامران گئے ہیں' کیونکہ ان پر جو ذمہ داری تھی وہ انہوں نے ادا کر دی۔ انبیاء کی سنت یہی ہے کہ حق کی بات آخری وقت تک اور آخری سانس تک کہتے رہئے۔ اگر کوئی قبول کرے گا تو اپنے بھلے کو' اور جو اسے رد کرے گا یا اس کی مخالفت کرے گا تو وہ اس کا اللہ کے حضور جوابدہ ہو گا۔ اگر کوئی آپ کی نیت پر حملہ کرے گا تو اس کی جوابدہی بھی اس ہی کے ذمے ہو گی' اس کے پلے میں اگر کوئی بھلائی یا نیکی ہے تو وہ آپ کو مل جائے گی اور آپ کے اعمال نامے میں اگر کوئی برے اعمال ہیں تو انہیں وہ اپنے اعمال نامے میں درج کروا لے گا۔ اس طرح ہمارے لئے تو ہر

(باقی صفحہ ۷۱ پر)

الہدیٰ قسط: ۸۶

مباحث صبر و مصابرت
درس نمبر: ۲

اہلِ ایمان کے لیے ابتلاء و امتحان سے گزرنا لازمی ہے!

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں

(۳)

اس کے بعد اب وہ مضمون آ رہا ہے جو اس سے قبل کسی قدر تفصیل کے ساتھ منافقت کی وضاحت کے ضمن میں سورۃ المنافقون کے درس میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سورۃ العنکبوت جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں، مکی سورۃ ہے اور مکی دور کے بھی زیادہ سے زیادہ درمیانی عرصے میں اس کا نزول ہوا۔ اس اعتبار سے نفاق کی اس معروف صورت کا ابھی مسلمانوں کی صفوں میں کہیں دور دور نشان نہیں تھا کہ جس کا تصور بالعموم ہمارے ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ منافق وہ ہے کہ جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی نیت سے اسلام قبول کرے، اس نے محض ظاہراً اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو، اندرونی طور پر وہ پکا کافر ہو، وغیرہ۔ مکی دور میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہاں تو کلمۂ شہادت کا زبان پر لانا معاشرے کو چیلنج کرنے اور اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کرنے کے مترادف تھا۔ یہ گویا ایسے ہی تھا کہ کوئی انسان خود ہر طرح کی مصیبت کو دعوت دے اور آگے بڑھ کر للکارے۔ لہٰذا اس معروف نفاق کا ابھی کہیں دور دور تک امکان نہیں تھا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے پھر وہ کون سا نفاق ہے جس کا ذکر اس سورہ مبارکہ میں ہو رہا ہے ——— یہ ہے درحقیقت وہ اصل نفاق جو کم ہمتی، بزدلی اور قوتِ ارادی کی کمزوری سے عبارت ہے کہ اگرچہ ایمان جب قبول کیا تھا تو اس کی FACE VALUE

پر قبول کیا تھا' نبی کی بات دل کو لگی تھی تبھی اسے تسلیم کیا تھا۔ لیکن پھر ایمان کے کٹھن تقاضے جب سامنے آنے لگے' مصائب' تکالیف اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا تو اس سے طبیعت گھبرانے لگی اور گریز کی طرف مائل ہونے لگی۔ اگر تو ان مشکلات کی وجہ سے کوئی انسان دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں پس و پیش کرنے لگے' دین کے راستے میں اس کے قدم رکنے لگیں اور گومگو کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جائے تو یہی درحقیقت مرضِ نفاق کا نقطۂ آغاز ہے!

نفاق کا نقطۂ آغاز

نفاق اور منافقت کا یہ نقطۂ آغاز اس آیۂ مبارکہ میں بڑی وضاحت سے سامنے آتا ہے:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ"

"لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر' پھر جب انہیں ایذا پہنچائی جاتی ہے اللہ کی راہ میں (کچھ انفاقِ مال اور بذلِ نفس یعنی جان و مال کے ایثار کا مرحلہ آتا ہے یا کوئی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں) تو وہ لوگوں کی (طرف سے ڈالی ہوئی) اس آزمائش سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہیے۔"

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس رکوع میں فتنے کی دو نسبتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ہم نے فتنے میں ڈالا ہے' ہم تم سے پہلے لوگوں کو بھی آزماتے رہے ہیں۔ (وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ) اور دوسرے یہ کہ یہ فتنہ اور آزمائش لوگوں کی طرف سے ہے۔ یہ دونوں باتیں بیک وقت درست ہیں۔ اگرچہ یہ ابو جہل ہے جو مسلمانوں کو ستا رہا ہے' اور امیہ ابنِ خلف ہے کہ جو تکالیف پہنچا رہا ہے' لیکن یہ بغیر اذنِ رب نہیں ہے۔ فاعل حقیقی اور مؤثر حقیقی تو اللہ ہے جس کے اذن کے بغیر پتا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ بلالؓ پر جو

کچھ بیت رہا ہے عالمِ اسباب میں اس کا سبب امیہ ابنِ خلف ہے۔ آلِ یاسرؓ پر جو قیامت ڈھائی جا رہی ہے اس کا ذمہ دار اور اس ظالمانہ عمل کا کمانے والا ابوجہل ہے لیکن فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے' آزمائش اس کی جانب سے ہے' گو اس کی یہ آزمائش ابوجہل کے ہاتھوں اور امیہ ابنِ خلف ہی کے ذریعے سے اہلِ ایمان تک پہنچ رہی ہے۔ اس اعتبار سے فتنے کی یہ دونوں نسبتیں بیک وقت درست ہیں۔

اس آیت میں ان کم ہمت لوگوں کا ذکر ہے کہ جو' لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی آزمائش اور تکلیف سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کہ اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔ ان تھڑدلے لوگوں کی سیرت کا ایک دوسرا رخ اگلے الفاظ میں واضح کیا گیا۔

"وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ"

"اور اگر تمہارے رب کی طرف سے کوئی مدد آجائے تو یہ ضرور کہیں گے کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ تھے"

کہ آزمائش کا وقت آتا ہے تو پیچھے ہٹتے ہیں لیکن اگر کہیں کوئی فتح نصیب ہو جائے' اللہ کی مدد آجائے' کوئی مالِ غنیمت ہاتھ لگ جائے تو یہ پیش پیش ہوں گے اور کہیں گے کہ آخر ہم بھی تمہارے ساتھ تھے۔ ہم بھی ان ثمرات سے متمتع ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ ہمیں بھی اس مالِ غنیمت میں سے پورا پورا حصہ ملنا چاہئے۔ یہ ایک کردار ہے جو کسی ایک معین دور سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہر انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے والوں میں یہ کردار بھی موجود ہوتا ہے۔

تین قسم کے افراد

ہر انقلابی دعوت اور انقلابی جدوجہد میں تین کردار بالکل نمایاں طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دعوت کو ہرچہ باداباد کی شان کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

ع "ہرچہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم"

کہ اب جو ہو سو ہو' ہم نے کشتی پانی میں ڈال دی ہے۔ اب یہ تیرے گی تو ہم تیریں گے اور یہ ڈوبے گی تو ہم بھی ساتھ ہی ڈوبیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس انقلابی

جدوجہد اور اس کے مقصد (Cause) کے ساتھ ذہناً اور عملاً پورے طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس نظامِ کہنہ اور نظامِ باطل کو بچانے کے لئے میدان میں آتے ہیں اور کھلم کھلا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس باطل نظام کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور اس کے حمایتی بن کر کھڑے ہوتے ہیں کہ جو پہلے سے قائم ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے کے بالمقابل آتے ہیں اور اس طرح کشمکش و کشاکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام مجاہدہ ہے اور اس کشاکش میں بالعموم جنگ و قتال کی نوبت بھی آتی ہے۔ ایک تیسرا عنصر درمیان درمیان میں رہتا ہے۔ وہ اس فیصلہ کن انداز میں بازی کھیلنے کا قائل ہی نہیں اس لئے کہ اسے ہر حال میں اپنے مفادات عزیز ہیں۔ قرآن حکیم میں ایسے شخص کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: "لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ" کہ نہ وہ اِدھر اپنے آپ کو وابستہ اور IDENTIFY کرنے پر آمادہ ہے' نہ اُدھر یکسو ہو کر ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے بلکہ وہ ان کے بین بین رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کی حکمت عملی یہ ہوتی ہے کہ دونوں پارٹیوں کے ساتھ روابط رکھے تاکہ جس کسی کو بھی فتح نصیب ہو وہ ان کے پاس جا کر اپنی وفاداری یا اپنی کسی سابقہ خدمات کا حوالہ دے کر اپنے لئے تحفظات اور مراعات حاصل کر سکے۔ یہ ہے وہ منافقانہ کردار جس کو خوب اچھی طرح پہچاننے کی ضرورت ہے! اسی کردار سے پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ"

کہ یہ دراصل اس مرض اور قلبی روگ کا نقطۂ آغاز ہے جو آگے بڑھ کر منافقت کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ آگے فرمایا:

"اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ"

"تو کیا اللہ تعالیٰ زیادہ باخبر نہیں ہے اس سے کہ جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں پنہاں ہے"۔

جہان والوں کے سینوں کے پوشیدہ اسرار سے اللہ سے بڑھ کر کون واقف ہو گا؟ یہ لوگ اپنی غلط بیانی سے کسے دھوکہ دینا چاہتے ہیں' کس کو فریب دینا چاہ رہے ہیں!! سورۃ البقرہ کی آیت نمبر۹ میں اس فریب کاری کا پردہ چاک کر دیا گیا:

"یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ"

کہ یہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور اہلِ ایمان کو' درآنحالیکہ یہ دھوکہ نہیں دے رہے مگر خود اپنے آپ کو۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر تو معاملہ اللہ کے ساتھ ہے' وہ تو کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے' وہ تو لوگوں کے سینوں میں پوشیدہ باتوں سے بھی بخوبی آگاہ اور ان کی نیتوں اور ارادوں سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہے۔

جھوٹا مدعی ایمان کون؟

اور اب اگلی آیت کے مطالعے سے پہلے ذرا ذہن میں لائیے آیت ۳ کا آخری حصہ' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں: "فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ" ○ کہ اللہ بالکل کھول کر رکھ دے گا' ظاہر کر دے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔ وہاں سچے اور جھوٹے سے حقیقتاً جو مراد تھی یہاں اس پر سے پردہ اٹھا دیا گیا۔ اور بات بالکل کھول دی گئی۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ○

کہ اللہ کھول کر رہے گا' الم نشرح کر دے گا' بالکل واضح کر دے گا کہ کون ہیں وہ جو واقعتاً صاحبِ ایمان ہیں' حقیقتاً مومن ہیں' جو قلب و ذہن کی یکسوئی کے ساتھ ایمان لائے ہیں' جو اس عزمِ مصمم کے ساتھ آئے ہیں کہ ہرچہ باداباد' اور کون وہ ہیں جنہوں نے اس وادی میں قدم رکھا تو ہے لیکن تحفظات کے ساتھ! جنہیں اس راہ کے مصائب و مشکلات کے مقابلے میں جان و مال کا تحفظ زیادہ عزیز ہے' جنہوں نے گوہ کے بل کی طرح اپنے لئے دونوں راستے کھلے رکھے ہیں کہ حالات کا اونٹ خواہ کسی کروٹ بیٹھے انہوں نے اپنے تحفظ کا سامان کیا ہوا ہے' جن کی کم ہمتی اور بودے پن کا یہ عالم ہے کہ اللہ کی راہ میں

جیسے ہی کوئی آزمائش آتی ہے وہ اس طرح گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کوئی آسمانی آفت ٹوٹ پڑی ہو!!! ------

پھر نوٹ کر لیجئے کہ اگرچہ یہ مکی سورت ہے' اور مکی دور کے بھی وسطی حصے سے اس کا تعلق ہے جبکہ ابھی اس نفاق کا دور دور امکان نہیں تھا جو بعد میں مدنی دور میں پورے طور سے ظاہر ہوا لیکن یہاں صاف الفاظ میں 'نفاق' اور 'منافقت' کا ذکر موجود ہے۔ گویا پیشگی متنبہ کر دیا گیا کہ اس راہ میں اگر کم ہمتی کا مظاہرہ کیا تو یہ طرزِ عمل انسان کو منافقت کی آخری سرحدوں تک لے جا سکتا ہے۔

نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا ایک پر فریب انداز

اس کے بعد انہی نوجوانوں کا ایک اور مسئلہ زیر بحث آ رہا ہے جن پر ان کے والدین کا دباؤ تو تھا ہی' ان کے بڑے اور بزرگ' بڑے ہی ناصحانہ اور مشفقانہ انداز میں ایک بات ان سے کہتے تھے جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ یہ وہ معاملہ ہے جس کا تجربہ ہر اس نوجوان کو ہو گا جو کسی بھی انقلابی دعوت سے منسلک ہو۔ یہ باتیں وہ ہیں کہ جن سے ہر انقلابی جدوجہد میں فی الواقع سابقہ پیش آتا ہے۔ فرمایا:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ

"اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا (جو کفر کی روش پر قائم تھے) ان لوگوں سے کہ جو ایمان لائے تھے کہ اتباع کئے جاؤ ہمارے ہی راستے کا اور ہم اٹھا لیں گے تمہاری خطاؤں کا بوجھ!"

یہ نوجوانوں کو بہکانے اور ورغلانے کا ایک انداز تھا جو قوم کے ان بڑے بوڑھوں نے اختیار کیا جو خود شرک پر قائم تھے۔ وہ بڑے مشفق اور خیر خواہ بن کر ان نوجوانوں سے کہ جو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے' یہ کہتے تھے کہ بالکل بے فکر ہو کر چلے آؤ اپنے آباؤاجداد کے راستے پر' آنکھیں بند کر کے ہمارے پیچھے چلتے رہو' ہماری پیروی کرتے رہو' ہم ہی حق پر ہیں' آخر اپنے آباؤاجداد کے راستے کو کیوں ترک کرتے ہو!! پھر مزید ترغیب کے طور پر اتمامِ حجت کے انداز میں وہ کہتے تھے کہ اگر واقعی

تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے آباؤاجداد کا یہ راستہ غلط ہے اور تمہاری سمجھ میں ہماری بات نہیں آ رہی تو بھی ذرا سوچو کہ اگر تمہاری ساری ذمہ داری ہم اٹھالیں تو پھر تمہارے لئے تشویش کا کون سا معاملہ باقی رہ جاتا ہے! مطمئن رہو' ہم خدا کے ہاں تمہاری طرف سے جوابدہی کریں گے' تمہاری ذمہ داری ہم قبول کریں گے۔ اگر فی الواقع ہم غلطی پر ہوئے تو بھی گھبراؤ نہیں' تمہاری خطاؤں کا بوجھ ہماری گردنوں پر ہو گا۔ فرمایا۔

وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

"اور نہیں ہیں وہ اٹھانے والے ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ بلاشبہ یہ لوگ جھوٹے ہیں"

وہاں تو ہر ایک کو اپنی جواب دہی کرنی ہے' کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔

یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں' دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں جس شدت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی ہے اور اگلی آیت میں جس طرح اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر ظاہر ہو رہا ہے' اس کے پس منظر میں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اس طرزِ خطاب میں اور فریب آمیز طرزِ تکلم میں واقعتہً کچھ لوگوں کے لئے کچھ وزن تھا۔ آخر جب قوم کے بڑے بوڑھے کوئی بات اپنے تجربے کے حوالے سے کہتے ہیں تو ان کی بات بالعموم توجہ سے سنی جاتی ہے۔ دعوتِ حق پر کان دھرنے والے نوجوانوں پر اثرانداز ہونے کے لئے بزرگانِ قوم کی گفتگو کا انداز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ میاں ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے' ہم نے دنیا دیکھی ہے' تم ابھی نوعمری کے دور میں ہو' تمہیں اپنے نفع اور نقصان کی ابھی سمجھ نہیں ہے' کوئی سرپھرا شخص ہے جو تمہیں غلط راستے پر ڈال رہا ہے' وہ تمہاری دنیا برباد کرکے رکھ دے گا' ہمارے راستے پر آؤ' ہم تمہاری رہنمائی کریں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ان کی طرف سے سننے میں آتی ہیں اور اس بات کا امکان ہر دم رہتا ہے کہ کسی وقت انسان اگر کسی خاص کیفیت میں ہو اور ان بزرگوں کے ساتھ اس کے حسنِ ظن کا رشتہ برقرار ہو تو وہ ان سے کوئی اثر قبول کرلے۔ لہٰذا پوری شدت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی اور ان کے فریب کا پردہ چاک کر

دیا گیا کہ: "اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ○" بلاشبہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں' دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں!!

اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا

اس دورِ زوال میں جبکہ بہت سے دینی تصورات مسخ ہوگئے ہیں' ہمارے ذہنوں میں بالعموم یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ روزِ حشر کوئی وہاں ہمیں چھڑا لے گا' اور ہمارا بوجھ اٹھالے گا' کسی کے دامن سے وابستہ ہوکر نکل جائیں گے اور اس طرح ہمارا بیڑا پار ہوجائے گا۔ یہ تمام تصورات ایک طرف رکھئے اور قرآن مجید کا انداز دیکھئے! "وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ" (اور وہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہوں گے) اور "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى" (کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہوگا) وہاں تو اپنی اپنی گٹھڑی ہوگی اور اپنا اپنا کاندھا۔ ہر ایک کو اپنے بوجھ خود اٹھانے پڑیں گے۔ ہر شخص کو اپنی جوابدہی خود کرنی ہوگی: "وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا" قیامت میں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں پیش ہونا ہوگا اور اسی اعتبار سے اس کا محاسبہ ہوگا کہ تم کیا تھے' کہاں تھے؟ تمہاری صلاحیتوں کا مصرف کیا ہوا؟ تمہیں ہم نے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی اس سے کتنا کچھ فائدہ اٹھایا؟ یہ دلیل وہاں ہرگز قبول نہیں ہوگی کہ ہم نے تو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم کی پیروی کی تھی' اگر ہم غلطی پر تھے تو اس کے ذمہ دار ہمارے بڑے بزرگ ہیں' ہم نہیں ہیں!!

اضافی بوجھ اٹھانے والے!

اب اگلی آیت پر اپنی توجہ کو مرکوز کیجئے! مشرکین کے اس گھناؤنے کردار پر اللہ کا غضب بہت نمایاں ہے:

"وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ"

یہ لوگ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ' اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور کچھ بوجھ بھی (انہیں اٹھانے ہوں گے)

نوجوانوں کو فکری طور پر داغدار کرنے اور گمراہ کرنے کی یہ کوشش' ان کو غلط راستے پر

ڈالنے کی یہ سعی یقیناً ان کے اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافے کا باعث بنے گی۔ اس سے ان کی ذمہ داری بلاشبہ بڑھ رہی ہے' لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نوجوان جو ان کے فریب میں آکر اپنی منزل کھوٹی کر رہے ہیں' اپنی ذمہ داری سے دستکش ہو سکیں گے اور بازپرس سے بچ جائیں گے۔ نہیں' ان کی ذمہ داری میں ہرگز کمی نہیں آئے گی۔ انہیں اپنے فیصلے کی پوری ذمہ داری خود قبول کرنی پڑے گی۔ یہ دلیل کہ کسی نے مجھے اس گمراہی کے راستے پر ڈالا' اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ہر شخص کو جو کچھ دیا گیا ہے' جو جسمانی صلاحیتیں اور ذہن و فکر کی قوتیں عطا کی گئی ہیں' ان کی بنیاد پر وہ خود انفرادی حیثیت میں مسئول ہے۔ ہاں وہ لوگ جو دوسروں کو گمراہ کرنے اور انہیں غلط راستے پر ڈالنے کی سعی کر رہے ہیں' اپنے اس طرزِ عمل سے اپنے بوجھ میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی خطاؤں کے ساتھ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانا ہوگا جو ان کی باتوں میں آکر گمراہی کا شکار ہوگئے تھے یہ اضافی بوجھ بھی ان کے سروں پر ہوگا! یہ آیت مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہو رہی ہے۔

"وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ" ○

"اور لازماً ان سے باز پرس ہو کر رہے گی قیامت کے دن' اس افترا کے بارے میں جو وہ کرتے رہے"

جو جھوٹ یہ گھڑ رہے تھے' جو افترا پردازیاں کر رہے تھے اور جو غلط دعوے کر رہے تھے کہ ہم تمہارا بوجھ اٹھائیں گے' اس سب کے بارے میں انہیں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ان سے اس معاملے میں نہایت سخت بازپرس ہو کر رہے گی!------ (جاری ہے)

ضرورت رشتہ

دینی گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک ۲۲ سالہ لڑکی' تعلیم ایم اے (اکنامکس) کے لئے جس کے والد مرحوم واپڈا میں گریڈ ۱۸ کے آفیسر تھے' مناسب رشتہ درکار ہے۔ تعلیم ایم اے ہو تو بہتر ہے!

برائے رابطہ: تنویر الحق (بھائی)

14- حاجی پارک' رحمان پورہ' اچھرہ' لاہور فون: 6662437

خطوط و نکات

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم
کے ایک خط کے ضمن میں
علمی تعاون کی درخواست

از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری

مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کے زیرِ اہتمام مولانا ابوالکلام آزاد کے تقریباً پانچ سو خطوط کا مجموعہ ترتیب و تدوین کے آخری مراحل میں ہے۔ یہ خطوط دو سو سے زیادہ معروف اور غیر معروف (افراد) کے نام ہیں۔ اس مجموعۂ مکاتیب میں غبارِ خاطر، نقشِ آزاد اور تبرکاتِ آزاد کے خطوط شامل نہیں۔ اس مجموعے میں مولانا کا ایک خط قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے نام ہے جو درج ذیل ہے:

۳۔ اسٹور روڈ، کلکتہ

۲۰۔ ۱۱۔ ۱۹۳۳ء

حبّی فی اللہ!

خط پہنچا۔ افسوس ہے کہ میں کوئی ایسی کتاب نہیں بتا سکتا جو بہ حالت موجودہ آپ کے مقصد کے لئے کار آمد ہو۔ البتہ اگر اس علاقے کے ضروری حالات میرے علم میں آجائیں تو میں آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ اسلامی نظامِ حکومت کے اصول پیش نظر رکھتے ہوئے کیا کیا اقدام وہاں کئے جا سکتے ہیں اور مناسبِ حال کیا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مجھے اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ نواب یوسف علی خان صاحب کے پیشِ نظر یہ مقصد ہے۔ بلاشبہ بہ حالت موجودہ یہ ممکن نہیں کہ کامل اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔ تاہم بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر علم و بصیرت کے ساتھ قدم

اٹھایا جائے تو عجب نہیں کہ اس بارے میں ایک وقیع نمونہ قائم ہو جائے۔ لیکن خط و کتابت کی جگہ بہتر تھا کہ کوئی صاحب مجھ سے مل لیتے، جنہیں وہاں کے تمام حالات کا علم ہوتا۔ میں ان شاء اللہ عن قریب دہلی کا قصد کروں گا۔ پہلی دسمبر سے ۱۵ تک وہاں ملاقات ہو سکتی ہے اور دہلی بہ مقابلہ کلکتہ کے قریب ہے۔ یا تو آپ آجائیں یا کوئی اور صاحب جو ضروری سوالات کا جواب دے سکیں۔

بہت ہی بہتر ہوتا اگر یوسف علی خان صاحب خود مل سکتے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو پھر آپ علاقے کی تفصیلی حالت تحریر کریں:

- آبادی کتنی ہے؟
- رئیس کو کس درجے کے اختیارات حاصل ہیں؟
- آبادی تمام تر مسلم ہے یا غیر مسلم بھی ہیں؟
- موجودہ حالت عدالتی اور انتظامی حیثیت سے کس نوعیت کی ہے؟ وغیرہ

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابوالکلام

میں اہلِ علم اور اصحابِ نظر کا نہایت شکر گزار ہوں گا کہ وہ مجھے نواب یوسف علی خان کی شخصیت، ان کی سیرت اور ان کے عزائم کے بارے میں اپنی معلومات سے استفادے کا موقع دیں اور یہ بتائیں کہ ان کی ریاست / جاگیر وغیرہ کہاں تھی؟ امید ہے کہ ان سوالات کے جوابات سے قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور نواب صاحب کے تعلقات سے پردہ ہٹ جائے گا۔

(ڈاکٹر) ابو سلمان شاہ جہان پوری
مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اینڈ لائبریری
۹/۱ علی گڑھ کالونی ۔ کراچی ۷۵۸۰۰

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

"جہاد و قتال کی حقیقت دفاعی نہیں، اقدامی ہے"!

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی تالیف سے اقتباسات پر مشتمل ایک مکتوب

امیرِ محترم، تنظیمِ اسلامی
السلام علیکم و رحمۃ اللہ

اس بندۂ ناچیز کی نظر سے حال ہی میں دیباچہ "سیرت المصطفیٰ" (جو کہ مولانا ادریس کاندھلویؒ کی تالیف ہے) گذرا جس میں مولانا نے اپنے مخصوص مجاہدانہ انداز میں ان حضرات کی بھرپور گوشمالی کی ہے جو کہ تاریخِ اسلامی میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کو محض مدافعانہ بیان کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اور جب خداوند ذوالجلال کے باغیوں سے جہاد و قتال کا ذکر آتا ہے تو بہت پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اس کو اسلام کے چہرہ پر ایک بدنما داغ سمجھ کر دھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تو ممکن نہ ہوا کہ اعداء اللہ سے جہاد و قتال کی آیات و احادیث کا انکار کر سکیں۔ اس لئے تاویل کی راہ اختیار کی کہ یہ غزوات و سرایا اعلاء کلمۃ اللہ یعنی اللہ کا بول بالا کرنے اور آسمانی بادشاہت قائم کرنے اور قانونِ خداوندی کو علی الاعلان جاری کرنے کے لئے نہ تھے بلکہ محض اپنی حفاظت اور جان بچانے اور دشمنوں کی مدافعت کے لئے تھے۔"

(سیرت المصطفیٰ' جلد اول' اشاعت ۱۹۹۲ء صفحہ ۹' سطور ۲۶ تا ۲۱)

مزید لکھتے ہیں:

"اگر جہاد کی حقیقت فقط مدافعت ہوتی تو قرآن و حدیث میں اس کی ترغیب کی حاجت نہ تھی۔ دشمن کی مدافعت کا لزوم اور وجوب عقلی اور فطری ہے' کسی عاقل کا اس میں اختلاف نہیں۔ کیا خلفاءِ راشدین کے تمام جہادات دفاعی تھے؟ کوئی جہاد ان میں اقدامی نہ تھا اور کیا سلاطینِ اسلام کے ہندوستان پر حملے بھی اقدامی نہ تھے؟ ایک

ہزار سال قبل کیا کسی لالہ اور دھوتی پرشاد کی مجال تھی کہ وہ کسی اسلامی حکومت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کا تصور بھی کرسکے اور شاہانِ اسلام ان کی مدافعت کے لئے اٹھیں۔"

(سیرت المصطفیٰ جلد اول، صفحہ ۱۰ سطور ۳ تا ۹)

والسلام مع الاکرام

فیاض اختر میاں

نقیب اسرہ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

بقیہ : تذکرہ و تبصرہ

حال میں نفع ہی نفع ہے، نقصان کا کوئی معاملہ ہے ہی نہیں ----- لیکن اپنی بات میں نے آج اس لئے واضح طور پر بیان کردی کہ ہمارا صحیح صحیح موقف سب کے سامنے آجائے اور سورۃ الانفال کے الفاظ "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ" کے مصداق اس کے بعد جسے ہم سے اختلاف کرنا ہو وہ علیٰ وجہ البصیرت کرے، اور تعین کے ساتھ کرے کہ آپ کی فلاں بات غلط ہے، لہٰذا ہم اسے نہیں مانتے۔ اس کے برعکس مبہم سا اختلاف اور مبہم انداز میں نیتوں پر حملے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے!!

اَقولُ قَولی ھٰذا وَ اَستغفرُ اللّٰہَ لی وَلکم وَلِسائرِ المُسلِمینَ وَالمُسلِمات ○○

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۵۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت، قیمت فی نسخہ ۱۲ روپے

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا سہ روزہ دورۂ کراچی

امیر تنظیم اسلامی دو ماہ بعد کراچی تشریف لائے' پہلے آپ ہر ماہ تشریف لایا کرتے تھے۔ جب سے تحریکِ خلافت کی تنظیم نو ہوئی ہے امیر تنظیم کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ گو انہوں نے اب باقاعدہ بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھ دیا ہے لیکن اس کے باوجود جوشِ عمل میں کمی نہیں ہوئی تاہم اس کا سارا دباؤ صحت پر پڑتا ہے —— رفقاء اس بات کو سمجھتے ہیں کہ صحت کی سلامتی کے لئے امیرِ محترم پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے مگر چاہتے بھی یہی ہیں کہ ہر جگہ ہر موقع پر امیرِ محترم ہی کو سنا جائے۔ آپ کا یہ دورہ معمول کا دورہ تھا اور پروگرام کی ترتیب بھی پہلے جیسی تھی مگر اس بار ایک تقریر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ آپ کا قیام ناظمِ حلقہ سندھ و بلوچستان جناب نسیم الدین صاحب کے ہاں رہا۔ ۸ر جون کو آپ نے تنظیم اسلامی شرقی نمبرا (گلشن اقبال) کے دفتر میں عربی کلاس کا معائنہ کیا' اس عربی کلاس میں بیس (۲۰) مرد اور بیس (۲۰) خواتین شریک ہیں' اگرچہ داخلے کے وقت کلاس تیس (۳۰) مرد اور تیس (۳۰) خواتین پر مشتمل تھی۔ بہرکیف شرکاءِ کلاس بڑے شوق اور دلچسپی سے عربی پڑھ رہے ہیں۔

شام کا وقت یعنی بعد نماز مغرب ملتزم رفقاء کے لئے مخصوص تھا۔ اس پروگرام میں امراءِ تنظیم اپنی رپورٹیں پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوتی ہے۔ حسبِ پروگرام بعد مغرب قرآن اکیڈمی کراچی میں ملتزم رفقاء جمع ہوئے جن کی تعداد ۴۹ تھی۔ تلاوت قرآن مجید سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد کراچی کی مختلف تنظیموں کے امراء نے اپنی رپورٹیں پیش کیں۔ آخر میں حلقہ کی رپورٹ پیش کی گئی جسے معتمد حلقہ نے پیش کیا۔ اس رپورٹ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یکم مئی کو ملتان میں خلافت کنونشن میں حلقہ کی طرف سے ۹۲ افراد نے شرکت کی۔ رپورٹوں کے بعد رفقاء کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ تقریباً دس (۱۰) رفقاء نے اپنے خیالات سے امیرِ تنظیم کو آگاہ کیا۔ یہ "فیڈ بیک" کا نظام تنظیم اسلامی میں ابتداء سے جاری ہے۔ رفقاء کے ذہنوں میں جو شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں وہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں اور اس کے بعد امیرِ محترم کی طرف سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ تربیت کا بھی ایک حصہ ہے۔ اسی طرح کی مرکزی توسیعی مشاورت سال میں ایک بار تین چار یوم کے لئے منعقد ہوتی ہے جس میں پاکستان کی تمام تنظیموں کے وہ رفقاء جو اظہارِ خیال کرنا چاہیں

تشریف لا کر اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ امیرِ محترم نے اس نشست میں پیش کئے گئے سوالات کے جوابات دیئے۔ قومی مزاج کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارے بعض رفقاء منفی تحریکوں کے اثرات قبول کر لیتے ہیں جن کی وجہ سے بعض شکوک جنم لیتے ہیں۔ منفی تحریکیں جذبات میں اشتعال پیدا کر کے اپنے مقاصد کے لئے لوگوں کو استعمال کرتی ہیں' اس سے کوئی مثبت کام اور خیر برآمد نہیں ہوتا' جبکہ پیہم' مسلسل پابندی کے ساتھ کام کرنے کیلئے کوئی تیار نہیں۔ ہمیں لوگوں کو اس کا عادی بنانا ہے کہ وہ ایک فکر کو قبول کر کے حرکت کریں' ہمیں انتہا پسندی نہیں اختیار کرنی چاہئے' عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبے کے تحت حرکت کرو۔

۱۰- جون صبح ۱۱ بجے سے ۱ بجے تک دفتر حلقہ میں انفرادی ملاقاتوں کا وقت تھا۔ اس سے قبل صبح کے وقت جناب نسیم الدین صاحب کے گھر پر ہفت روزہ "معیار" کو انٹرویو دیا جس کا دورانیہ ایک گھنٹہ پر مشتمل تھا۔ امیرِ محترم کے دورۂ کراچی کے ضمن میں ایک بات طے ہے کہ وہ ایک شام کسی ایک تنظیم کے دفتر میں گزاریں گے۔ اس دوران آپ رفقاء میں گھل مل جاتے ہیں' اکٹھے بیٹھتے ہیں' سوال و جواب کی ہلکی پھلکی نشست بھی ہو جاتی ہے۔ آج کی شام تنظیم اسلامی شرقی نمبر۳ کے لئے مخصوص تھی جس کے امیر جناب نوید احمد صاحب ہیں۔ آپ نے امیرِ محترم کی تشریف آوری پر ایک خطاب کا اعلان بھی کر دیا تھا اور اس کے لئے رفقاء نے کچھ ہوم ورک بھی کیا ہوا تھا۔ یہ خطاب مسجد طیبہ کورنگی نمبر۶ میں بعد مغرب ہوا۔ اس کے لئے موضوع کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔ موضوع تھا عظمتِ قرآن۔ حاضری تین صد کے لگ بھگ تھی۔ لوگوں نے بڑے انہماک سے اس تقریر کو سنا۔ آپ نے فرمایا: میں آپ کے سامنے عظمتِ قرآن کو مختلف حوالوں سے پیش کرونگا۔ پہلا اس ذات کے حوالے سے جس کا یہ کلام ہے۔ دوسرا اس ہستی کے حوالے سے جس پر یہ نازل ہوا۔ تیسرا مسلمانانِ پاکستان کے حوالے سے کہ ان کے لئے اس کی خصوصی اہمیت کیا ہے' اس لئے کہ یہ سرزمین اللہ کی نازل کردہ ہدایات کی تنفیذ کے لئے حاصل کی گئی ہے۔ آپ نے موضوع زیرِ بحث پر سیر حاصل گفتگو کی اور اسی حوالے سے لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ مسجد طیبہ سے متصل ایک کشادہ پلاٹ ہے جسے مسجد کی انتظامیہ نے قرآن اکیڈمی کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ اہلِ کورنگی اس پلاٹ پر قرآن اکیڈمی کی تعمیر کریں گے۔

بعد نمازِ عشاء ایک رفیق کے گھر پر اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں تنظیم میں شامل ہونے والے نئے رفقاء کا تعارف ہوا۔ کورنگی کے رفقاء کی طرف سے کھانے کا انتظام تھا۔ بعد طعام یہ نشست ختم ہوئی۔ ۱۱ جون یوم الجمعہ کا خطاب قرآن اکیڈمی کراچی میں ہوا۔ اس کے لئے اخبار

میں اشتہار بھی دیا گیا تھا جس کا عنوان تھا "پاکستان کی موجودہ سیاست اور تنظیم اسلامی و تحریک خلافت کا موقف"۔ یہ عنوان خالص سیاسی نوعیت کا تھا' اس لئے زیادہ حاضری کی توقع تھی اور حاضری تھی بھی یقیناً کہیں زیادہ۔ آپ کی تقریر کا دورانیہ ڈیڑھ گھنٹہ کا تھا۔ (یہ پوری تقریر اسی شمارے میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیرِ عنوان شامل ہے) اس موقع پر انجمن خدام القرآن سندھ کی طرف سے قرآنی معلومات اور تربیتی کورس کے دس (۱۰) روزہ پروگرام کا اعلان ایک ہینڈ بل کے ذریعہ کیا گیا تھا جسے وہاں تقسیم کیا گیا۔ یہ دس روزہ کورس بنیادی طور پر اسکول اور کالج کے طلباء کے لئے ہے' دوسرے لوگ بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ چھٹیوں کا اس سے بہتر مصرف اور نہیں ہو سکتا۔

بعد نمازِ عصر جناب شیخ محمد انعام صاحب ناظم تحریک خلافت سندھ کی بچی کا نکاح امیرِ محترم نے پڑھایا۔ اس تقریب میں شرکت کے بعد آپ لاہور کے لئے عازمِ سفر ہوئے۔

دو روزہ تربیت گاہ' کراچی

(۱۷ جون تا ۱۹ جون ۹۳ء)

نظام العمل کے مطابق رفقاءِ تنظیم کو ہر مہینہ میں دو دن تنظیم کے لئے فارغ کرنے ہوتے ہیں۔ ان دو دنوں میں دعوتی اجتماعات مختلف علاقوں میں منعقد کئے جاتے اور ساتھ ساتھ رفقاء کے لئے تنظیمی و تربیتی پروگرام بھی ان دو دنوں میں شامل کئے جاتے ہیں۔ اس سے قبل کراچی سے نکل کر حیدر آباد اور میرپور خاص میں دو روزہ دعوتی پروگرام ہو چکے ہیں۔

ماہِ رواں یعنی جون میں اس دو روزہ پروگرام کو ایک تربیتی کیمپ کی حیثیت دی گئی تاکہ فکر اور مقصد کے شعور کو اجاگر کیا جائے اور رفقاء ایک بار پھر تازہ دم ہو کر مقصد کے حصول میں بھرپور طور پر شریک ہو جائیں۔ انہی مقاصد کے تحت یہ تربیت گاہ منعقد کی گئی۔ اس تربیت گاہ کا ایک اہم پروگرام یہ تھا کہ ہر رفیق اپنا تعارف بورڈ پر لکھے ہوئے سوالات کی روشنی میں کراتا تھا جس کے لئے صبح ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک کا وقت مقرر تھا۔ آپ کا نام کیا ہے؟ آپ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ؟ آپ نے بیعت کب کی تھی؟ مبتدی رفیق ہیں یا ملتزم؟ کس تنظیم سے تعلق ہے یا منفرد رفیق ہیں؟ آپ کی رہائش کس جگہ ہے اور ذریعۂ معاش کیا ہے؟ نظم کی پابندی کتنی کرتے ہیں' رپورٹوں کی ترسیل کا کیا حال ہے؟ آپ کے یہاں شرعی پردہ ہے کہ نہیں' غیر شرعی رسومات سے کس قدر مجتنب ہیں؟ بیعت سمع و طاعت کے تقاضے کس حد تک

پورا کرتے ہیں؟ اگر کوئی کمی ہے تو کس سبب سے؟ اس کمی کے لئے اگر کوئی تعاون درکار ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ وغیرہ

تمام رفقاء کے پاس کاغذ قلم موجود تھا اور اگر نہیں تھا تو فوری فراہم کردیا گیا تاکہ وہ ان تفصیلات کو اپنے پاس محفوظ کرلیں۔ اس طرح آپس میں ربط کا کام دے سکے۔ یہ دلچسپ اور افادیت سے بھرپور پروگرام ڈھائی گھنٹے جاری رہا۔ ۴۹ رفقاء نے جو اس تربیت گاہ میں شریک تھے' اس میں حصہ لیا۔ وقت اتنا زیادہ نہ تھا کہ بہت ساری تفاصیل رفقاء سے سنی جاتیں۔ اس مختصر تعارف میں بھی سبق آموزی کا بہت سامان موجود تھا۔ اس سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی' اور اس بات کا بھی کسی قدر اندازہ ہوا کہ ہر رفیق کا تنظیم سے کتنا تعلق ہے۔ اس پروگرام نے یقیناً مہمیز کا کام دیا ہوگا اور رفقاء میں آئندہ اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کا داعیہ ابھرا ہوگا۔

تربیت گاہ کے لئے ۱۷ جون کو رات دس رفقاء قرآن اکیڈمی میں جمع ہوئے تو ناظمِ حلقہ جناب نسیم الدین صاحب نے تربیت گاہ کے مقاصد اور اس کے پروگرام کی ترتیب سے رفقاء کو آگاہ کیا۔ اس ابتدائی نشست کے بعد رفقاء آرام کرنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ صبح ساڑھے تین بجے بیدار کردیا گیا' انفرادی نوافل کے لئے وقت دیا گیا۔ نمازِ فجر کے بعد جناب عابد جاوید صاحب نے درس قرآن مجید دیا۔ اس کے بعد وقفہ برائے آرام و ناشتہ تھا۔

صبح نو تا گیارہ بجے رفقاء کا وہ باہمی تعارفی پروگرام ہوا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے' بعد ازاں جناب عابد جاوید صاحب نے "تحریکِ خلافت اور تنظیم اسلامی کا ربط" کے موضوع پر خطاب کیا۔ قرآن مجید سے شجرۂ طیبہ کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ تنظیمِ اسلامی اس تحریک کے شجرۂ طیبہ کے تنے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس درخت کی جڑیں انجمن خدام القرآن سے عبارت ہیں اور تحریکِ خلافت کو اس کی شاخوں اور پتوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ رفقاء کو جمعہ کی تیاری کے لئے وقت دیا گیا۔ جمعہ کے خطاب کا قرعہ جناب محمد عبدالمقتدر صاحب کے نام نکلا۔ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قارون کے ساز و سامان اور دولت و ثروت کا ذکر کیا اور ان دو گروہوں کا حوالہ دیا جن میں سے ایک اس درجے مرعوب تھا کہ ان کے دل میں شدید حسرت پیدا ہوئی کہ کاش یہ دولت ہمیں بھی ملتی' جبکہ کچھ صاحب ایمان وہ بھی تھے جن کی نگاہ آخرت پر تھی اور جو دنیا اور اس کے مال و اسباب کی بے ثباتی سے بخوبی واقف تھے۔ قرآن نے اس پورے مکالمے کو نقل کیا ہے۔ یہ دو گروہ ہمیشہ سے دنیا میں رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آج بھی وہ گروہ موجود ہیں۔ اس واقعہ سے جو سبق ملتا ہے جناب عبدالمقتدر صاحب نے بڑی وضاحت سے بتایا۔ نمازِ جمعہ

کے بعد کھانا اور مختصر آرام کا وقفہ تھا۔ رفقاء پونے چار بجے شام اگلے پروگرام کے لئے جمع ہوگئے۔

ناظمِ حلقہ جناب نسیم الدین صاحب نے اس تربیت گاہ کے انعقاد اور اسے بھرپور بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے اہم پروگرام خود اپنے ذمے لے کر بڑی محنت اور جانفشانی سے انہیں مرتب کیا۔ یہ پروگرام نہایت مفید اور اہمیت کا حامل رہا۔ ایک مصنف جتنی محنت اپنی کسی تصنیف پر کرتا ہے اتنی ہی محنت تربیت گاہ کو بھرپور بنانے پر کی گئی تھی۔ آپ نے اپنے پروگرام کی ابتداء "دعوت کیا اور کیوں؟" کے سوالیہ انداز سے کی۔ دعوت سے کیا مراد ہے؟ دعوت کیوں دی جاتی ہے؟ داعی کا کام کیا ہے؟ دعوت کا ہدف کیا ہے؟ دعوت کی تدریج کیا ہے؟ یہ سوالات بورڈ پر درج کردیئے گئے اور رفقاء کو بھی اس لیکچر میں شریک کیا گیا۔ اس طرح یہ باتیں رفقاء کے ذہن نشین ہوتی گئیں۔ اس تربیت گاہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جناب نسیم الدین صاحب نے نئے رفقاء کو تقریری افق پر متعارف کرایا، اس طرح انہیں بات کرنے کا حوصلہ ملا، اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اپنے اعتماد کو بحال کرنے کا موقع ملا۔ ہم میں سے اکثر رفقاء اپنی صلاحیتوں سے خود واقف نہیں۔ اگر کچھ واقف بھی ہیں تو جھجک آڑے آتی ہے۔ اگر انہیں موقع دیا جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو مستقبل کے یہ بہترین مقرر بن سکتے ہیں۔

جناب اختر ندیم صاحب جو تنظیم اسلامی ضلع وسطی کے امیر ہیں انہیں جہاد کے مراحل اور حقیقتِ جہاد پر بات کرنے کا موقع ملا، ان کے نوٹس سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ تیاری کرکے آئے ہیں، ان کی یہ گفتگو بے حد پسند کی گئی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ جب رفقاء کو اپنے انداز پر بات کرنے کی دعوت دی گئی تو ان میں سے کئی ساتھیوں نے ان کی گفتگو کا حوالہ دیا۔ جی چاہتا ہے کہ ہمارے ان نئے مقررین کی گفتگو کے بعض اہم نکات درج کئے جائیں مگر رپورٹ کے طویل ہوجانے کے اندیشے سے صرفِ نظر کر رہا ہوں، صرف تعارف پر کتفا کر رہا ہوں --- اس کے بعد جناب نسیم الدین صاحب نے اپنی اس کاوش کو جسے خود انہوں نے "دعوتی گفتگو کا تجزیہ" کا عنوان دیا تھا، کئی قسطوں میں رفقاء کے سامنے بیان کیا۔ اس کے بہت سے ذیلی عنوانات تھے جن کے تحت سوالات تشکیل دیئے گئے تھے۔ امکانی جوابات جو مثبت بھی ہوسکتے تھے اور منفی بھی، ان سب کا احاطہ کیا گیا تھا۔ پھر ان میں داعی کے لئے جو رہنمائی کا پہلو تھا اسے بھی نمایاں کیا گیا تھا۔ ان مضامین کو سائنسی انداز پر مرتب کیا گیا تھا۔ اسے انتہائی جدید انداز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں داعی اور مدعو کا نفسیاتی تجزیہ بھی شامل تھا۔ جتنے ممکن سوالات ہوسکتے تھے انہیں نمایاں کیا گیا تھا۔ پھر ان پر جو ردِّ عمل متوقع تھا اسے بھی تفصیل سے

بیان کیا گیا تھا۔ اور اس کا اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ الفاظ کے استعمال کا کیا طریقہ ہونا چاہئے' الفاظ کے مدعو پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں؟ گفتگو کے وقت اعضاء و جوارح سے تعاون کا انداز کیا ہوگا؟ پھر ہمارے معاشرے میں جتنے طبقات ہیں انہیں سات حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کے ساتھ گفتگو کے انداز کو متعین کیا گیا' ان سب کے ممکنہ جوابی عمل کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے داعی کے لئے رہنمائی کے خطوط کو واضح کیا گیا۔

ناظمِ حلقہ کا یہ مقالہ جو انتہائی اہمیت کا حامل ہے اگر اس کے اقتباس ہی نقل کروں تو رپورٹ کا حجم خاصا بڑھ جائے گا۔ یہ مقالہ اس قابل ہے کہ تمام تنظیموں میں اس کا لازمی مطالعہ کیا جائے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی اس کا آخری مرحلہ یہ تھا کہ پچاس سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ تقسیم کیا گیا' ہر سوال کا جواب بھی اس میں تحریر تھا۔ لکھنے والے کو صحیح / غلط پر نشان لگانا تھا۔ ہر سوال کے دو نمبر تھے' ناظمِ حلقہ نے فرمایا کہ اس سوالنامے کو بھر کر آپ اپنے پاس رکھیں' میں سوالات کے صحیح اور غلط ہونے کو بیان کروں گا۔ آپ خود نمبر دیتے جائیں۔ آپ کے جوابات دیکھے نہیں جائیں گے۔ اگر آپ نے ۱۰۰ میں سے ۹۰ نمبر حاصل کئے تو یہ قابل رشک ہے' ۸۰ نمبر حاصل کئے تو عمدہ ہے' ۷۰ نمبر حاصل کئے تو اچھا ہے' اس سے کم نمبر حاصل کرنے والوں سے عرض کروں گا کہ میں اپنی بات صحیح طور پر آپ تک نہیں پہنچا سکا۔ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اس تربیت گاہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں نئے رفقاء نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔

نئے رفقاء میں سے جناب شمس العارفین صاحب نے جن کی تقریر کا موضوع "ایمان بالآخرت" تھا' آفاق اور انفس کے حوالے سے بہت خوبصورت انداز میں سمجھایا۔ کائنات کس قدر مربوط ہے' ایک سسٹم میں بندھی ہوئی ہے' اس تخلیق کا کوئی مقصد بھی ہے' اس کی وضاحت آپ نے قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے کی۔ مقررین کی اس فہرست میں جناب اعجاز لطیف صاحب کا نام بھی شامل تھا' جنہیں "قرآن کا انسانِ مطلوب" کا موضوع دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ ایک تقریر تیار کرکے لائے تھے مگر ناظمِ حلقہ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی گفتگو میں رفقاء کو بھی شریک کریں' لہٰذا انہوں نے رفقاء کو شریک کرنے کے لئے بورڈ کا سہارا لیا۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن کا انسان مطلوب ایک بندۂ مومن ہے۔ اس کے اوصاف کے ضمن میں وہ چار باتیں جو بنیادی ہیں بیان کیں: ایمان' عملِ صالح' تواصی بالحق' تواصی بالصبر۔ ان چاروں ذیلی عنوانات پر رفقاء سے کہا کہ وہ قرآن مجید کا حوالہ دیں' وہ خود بھی لکھ کر لائے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنی گفتگو میں رفقاء کو بھی شریک کرلیا۔ رفقاء نے بڑی دلچسپی سے اس پروگرام میں شرکت کی۔

تنظیم اسلامی شرقی نمبر۳ کے امیر جناب نوید احمد صاحب نے فجر کی نماز کے بعد جو درسِ قرآن مجید دیا اس کا عنوان تھا "جماعتی زندگی میں نجومی کی ستم کاریاں"۔ قرآن مجید کے بہت سے حقائق اسی وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جب آپ خود ان مراحل سے گزریں جن مراحل کے دوران یہ نازل ہوا تھا۔ جناب نوید احمد صاحب اپنی بے انتہا مصروفیت میں سے وقت نکال کر تشریف لائے تھے۔ پچھلے ہفتے ان کی شادی ہوئی تھی اور دو روز بعد ولیمہ تھا۔ انتظامات کی مصروفیات تنظیمی کام میں آڑے نہ آسکیں اور وہ پروگرام میں شریک ہوئے۔ تربیت گاہ کے آخری پروگرام میں ان کے ذمے تحریک کے کارکنوں کے اوصاف بیان کرنا تھا۔ آپ نے نہایت کم وقت میں نہایت اہم باتیں بیان کیں۔ آپ نے دس باتیں رفقاء کو نوٹ کرائیں: (۱) نصب العین کا شعور (۲) نصب العین کے حصول کے لئے مقصد کا تعین (۳) طریقۂ کار پر اعتماد (۴) اللہ تعالیٰ سے خصوصی تعلق (۵) باہمی الفت (۶) مثالی قوتِ برداشت (۷) ذاتی عمل (۸) دھن' لگن (۹) پابندیٔ نظم (۱۰) مستقل مزاجی ---- وقت کم تھا لہٰذا ان نکات کی مختصر تشریح فرمائی۔

گذشتہ سطور میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اس تربیت گاہ کا ایک اہم مقصد نئے رفقاء کے اندر چھپی ہوئی تحریری و تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا تھا۔ وقت کی کمی کے باعث آٹھ رفقاءِ گرامی کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے پانچ پانچ منٹ کے مختصر وقت میں اپنے خیالات کا بھرپور انداز سے اظہار کیا۔ ناظمِ حلقہ کے اختتامی کلمات کے ساتھ یہ تربیت گاہ اپنے اختتام کو پہنچی۔ آپ نے ان تمام رفقاء کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اس تربیت گاہ کے انتظامات اور انعقاد میں ان کا ساتھ دیا اور بعض کوتاہیاں اور خامیاں جو رہ گئیں ان کی نشاندہی کی۔ اس طرح یہ دو روزہ تربیت گاہ ایک بھرپور انداز سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یقیناً رفقاء نے اس تربیت گاہ سے بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کا حقیقی شعور بخشے اور دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(مرتب: نجیب صدیقی)

ضرورت رشتہ

راجپوت برادری کی ایک ۲۳ سالہ لڑکی' تعلیم ایم اے' کے لئے شریف' باعزت گھرانے سے رشتہ درکار ہے۔ لڑکا تعلیم یافتہ' دینی مزاج کا حامل اور برسرروزگار ہو۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ شادی سادگی سے انجام پائے گی۔

برائے رابطہ: ن م - مرکز تنظیم اسلامی
A / 67 علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

ناظمِ اعلیٰ پاکستان و ناظم حلقۂ سندھ و بلوچستان کا مختصر دورۂ کوئٹہ

اس دورہ کا پروگرام خاصی عجلت میں ترتیب پایا۔ حسبِ پروگرام ۲۷ مئی بروز جمعرات ناظمِ حلقہ سندھ و بلوچستان جناب محمد نسیم الدین صاحب بذریعہ بولان ایکسپریس کراچی سے کوئٹہ پہنچے اور اس کے تین گھنٹے کے بعد ناظمِ اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اباسین ایکسپریس کے ذریعے تشریف لے آئے۔ ان کے اس دورہ کا مقصد تنظیم اسلامی کوئٹہ کے رفقاء سے ملاقات اور ایک روزہ تربیتی پروگرام میں شمولیت تھا۔ اس ایک روزہ پروگرام کو کچھ اس طرح سے ترتیب دیا گیا تھا کہ تنظیم و تحریک کے کام کے حوالے سے رفقائے تنظیم کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں اور یہ کہ اب کام کو کیسے آگے بڑھایا جائے اور اشتراکِ عمل کی کیا صورت ہو گی۔ الحمد للہ کہ یہ پروگرام خاصا کامیاب رہا۔ اگر رفقاء کے ذہنوں میں کچھ سوالات تھے تو ان کا جواب انہیں مل گیا اور کام کرنے کا نیا جذبہ پیدا ہوا۔

پروگرام کا آغاز مغرب کی نماز کے بعد ہوا۔ ناظمِ اعلیٰ صاحب نے (امیرِ محترم کے خصوصی خطاب ۱۳ مئی کے حوالے سے) رفقاء کی جانب سے پیش کیے جانے والے اشکالات و سوالات کے جوابات دیئے۔ اس کے بعد ناظمِ حلقہ نے دعوت بذریعہ ذاتی رابطہ کی اہمیت پر ایک گھنٹہ تک لیکچر دیا۔ اس طرح یہ پروگرام رات سوا گیارہ بجے تک جاری رہا۔

اگلے روز یعنی ۲۸ مئی نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن کی نشست ہوئی جس میں ناظمِ اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے سورۂ شوریٰ کی آیات کے حوالے سے انقلابی تحریک کے کارکنوں کے اوصاف بیان کیے۔ وقفہ کے بعد ۹ بجے دوبارہ پروگرام کا آغاز ہوا۔ ناظمِ حلقہ جناب نسیم الدین صاحب نے اپنی رات والی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے انفرادی دعوت کے سلسلے میں اصولی اور بنیادی باتیں سامنے رکھیں۔ اس گفتگو کا خاص حصہ انفرادی دعوت (ذاتی رابطہ) کے حوالے سے عملی مسائل کا حل اور رہنمائی پر مشتمل تھا۔ مقرر نے اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے بلیک بورڈ اور عملی مثالوں سے کام لیا جس سے بات کو سمجھنے میں کافی آسانی پیدا ہوئی۔ یہ پروگرام دوپہر ایک بجے تک جاری رہا۔ اس ایک روزہ پروگرام کا آخری حصہ بعد نمازِ مغرب شروع ہوا جس میں اس سوالنامہ کے حوالے سے شرکائے تربیتی پروگرام کے سوالات کے جوابات دیے گئے جو ان سے پہلے ہی پُر کروا لیا گیا تھا۔ یہ پروگرام نمازِ عشاء پر اختتام پذیر ہوا۔

انفرادی ملاقاتیں: ناظمِ اعلیٰ اور ناظمِ حلقہ صاحبان کی کوئٹہ موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

ان احباب سے ملاقات کا پروگرام بھی رکھا گیا تھا جو یا تو پہلے سے یا اب تنظیم و تحریک سے واقف ہوئے تھے۔ ان حضرات میں سے مولانا خان محمد صاحب' مولانا رحمت اللہ صاحب' ور جناب ایاز صاحب سے ملاقاتیں کی گئیں۔ دو ایسے حضرات سے بھی خصوصی ملاقات ان کے گھر پر جا کر کی گئی جو کسی وجہ سے عملی طور پر تنظیم سے پیچھے ہٹ چکے ہیں۔ امید ہے کہ اس ملاقات کے نتیجے میں انشاءاللہ یہ دونوں حضرات پھر سے متحرک ہو جائیں گے۔ تنظیمی مسائل کے حوالے سے دو رفقاء سے بھی خصوصی ملاقات رہی۔

۲۹ مئی بروز ہفتہ شام ساڑھے چھ بجے یہ دونوں حضرات اباسین ایکسپریس کے ذریعے سکھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور یوں یہ دورہ اختتام پذیر ہوا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کے دُوررس مفید اثرات رونما ہوں گے۔

(مرتب: محمد راشد گنگوہی)

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت

ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب بزبان انگریزی

TURMOIL IN THE MUSLIM UMMAH TODAY

آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کی صورت میں دستیاب ہے

(یہ خطاب ان متعدد خطبات اور لیکچرز میں سے ایک ہے جو ڈاکٹر صاحب نے حالیہ دورۂ امریکہ کے دوران بزبان انگریزی وہاں مختلف شہروں میں دیئے)

آڈیو کیسٹ - /40 روپے میں (سی - 60 کے دو کیسٹ پر مشتمل) اور ویڈیو کیسٹ - /150 روپے میں حاصل کئے جاسکتے ہیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور 36 - کے' ماڈل ٹاؤن

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

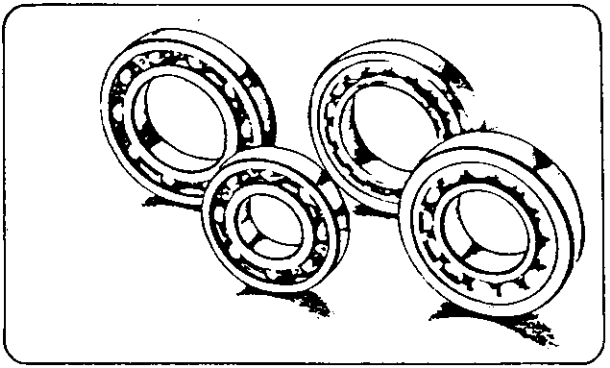

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : **(Opening Shortly)** Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REGD NO. L 7360
VOL. 42 NO. 7
July 1993